اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالی کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الحمدلله والصلاۃ والسلام علی رسول الله

امابعد

محترم قارئین کرام!

شاید ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جہاں امت کا کتاب سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اردو میں روزانہ نئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر آرہی ہیں اور معتد بہ تعداد ایسی بھی ہے جس نے کتاب سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نئی ٹیکنالوجی نے جہاں ہمیں سہولت پسند بنادیا ہے وہاں اس نے ہم سے مطالعہ کی عادت چھین لی ہے۔

اسماء الحسنیٰ کے سلسلے میں یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی بلکہ تمہید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی ہے کہ اس موضوع پر سلسلہ وار دروس اور بعد ازاں مضامین تیار کروں۔ یہ مضامین ہفتہ وار روشنی کی زینت بنتے رہے ہیں۔ دوستوں کے مشورے سے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ بھی تھا تاہم اب اسے ''ای بک'' کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ جہاں روایتی کتاب کی اشاعت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے وہاں نئے دور میں ''ای بک'' کو پسند کرنیوالوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دعا کریں کہ اس سلسلے کی دوسری کتاب بھی جلد تیار ہوکر منظر عام پر آجائے۔

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق تمام مسلمان محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو ہمارے لئے نافع اور عمل پر ابھارنے والا بنائے۔ آمین۔

عبدالستار خان

جدہ۔ 31 دسمبر 2011ء

nazar_70@hotmail.com

تمہید

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُواْ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَآئِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴾

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔'' (1)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و برتری، اس کے تقدس اور پاکیزگی اور اس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار ہوتا ہے، آیت مذکورہ میں ''الحاد'' کا لفظ استعمال کیا گیا جس کے معنی ہیں وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں: **الحد السهم الهدف** یعنی تیر نشانے سے ہٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام دیئے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں یا جن سے اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو'' (2)

....

(1) الاعراف 180

(2) تفہیم القرآن: سورۃ الاعراف، حاشیہ 142۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا علم کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ ''تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور اس تصور کی صحت و درستی تعلق کی صحت و درستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے'' (3)

انسانی وجود کے 3 پہلو قابل غور ہیں، روح، نفس اور جسم۔ روح انسانی وجود کا علوی پہلو ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَنَفَخۡتُ فِيهِ مِن رُّوحِيۡ ﴾

''اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی''۔(4)

روح انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے قائم کرتی ہے، اسی لئے اسے امر ربی کہا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَيَسۡأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنۡ أَمۡرِ رَبِّيۡ ﴾

''یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو یہ روح امر ربی ہے''۔(5)

روح انسان کو بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے بلکہ وجودِ انسانی میں روحِ خداوندی ہی انسانیت کا حقیقی شرف ہے۔

جسم مٹی سے بنا ہے لہذا اس کا رجحان ہمیشہ زمین کی طرف رہا ہے۔ وجودِ انسانی میں جسمانی تقاضے وجود کا سفلی (پست) پہلو ہیں۔ زن، زر اور زمین کی محبت اسی وجود کے کرشمے ہیں جبکہ نفس ان دونوں کے درمیان ہے۔ نفس کا ایک حصہ روح کے تقاضوں پر مبنی ہے، یعنی بلندیوں کی طرف مائل ہے جبکہ دوسرا حصہ حیوانی تقاضوں پر مبنی ہے اور پستیوں کی طرف مائل ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ

....

(3) ایضا۔

(4) الحجر 29

(5) الاسراء 85

نے نفس میں اچھائی اور برائی دونوں رکھ دیئے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴾

''اس نے نفس انسانی میں فجور اور تقویٰ دونوں رکھ دیئے ہیں''۔(6)

گویا نفس میں روح اور جسم، دونوں کے تقاضے جمع کر دیئے ہیں۔اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ نفس کے کون سے تقاضوں کو جلا دیتا ہے۔اگر وہ حیوانی وجود کے زمینی تقاضوں کو پورا کرنا اپنا مقصدِ حیات بنالیتا ہے تو وہ اپنی روح کو گھائل کرتا ہے، مادی اور شہوانی تقاضوں کا غلبہ بالآخر اسے حیوانات بلکہ ان سے بھی بدتر درجے پر گرا دیتا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ﴾

''پھر ہم نے اسے پست ہونے والوں کے پست ترین درجے کی طرف لوٹا دیا''(7)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ أُولَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴾

''یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر''۔(8)

نفس کے حیوانی تقاضوں پر قابو نہ پانا ہی اصل ناکامی ہے،ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ﴾

''اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے اسے دبایا''۔(9)

....

(6) الشّمس 8

(7) التین 5

(8) الاعراف 179

(9) الشّمس 10

اس نفس کی اصلاح کیلئے بھی اسماء الحسنیٰ کا علم بہت ضروری ہے۔

توحید اور اس کی حقیقت کو جاننے کیلئے ضروری ہے کہ اسماء الحسنیٰ کا علم حاصل کیا جائے۔توحید کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات اور صفات میں یکتا سمجھنا اور اس کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرانا۔توحید اور اس کی اقسام کو سمجھے بغیر دین کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ بات معروف ہے کہ توحید کی تین اقسام ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

توحید الوہیت:

بندے کے تمام افعال اللہ کیلئے خالص ہوں، عبودیت، اطاعت اور عجز و نیاز کے جتنے کام ہیں سب اللہ وحدہ لاشریک کے لئے خالص کر دیئے جائیں جن میں سجود و رکوع و نذر و نیاز و دعا وغیرہ شامل ہیں۔

توحید ربوبیت:

اللہ کو اس کے تمام افعال میں ایک مانا جائے۔افعال میں تخلیق اور تدبیر ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور نظام چلانے اور تدبیر کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

توحید اسمائے صفات:

اللہ کے تمام بابرکت نام اور صفات جو قرآن وسنت میں ثابت ہیں ان کو بغیر کسی تحریف، تعطیل، تشبیہ اور تمثیل کے تسلیم کرنا۔اس کی کوئی مثال ہے نہ اس کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

امت کی موجودہ پستی، ذلت ورسوائی کا علاج اسمائے حسنٰی کے علم میں ہے۔اسماء وصفات تمام مسائل کے حل کی اصل اور بنیاد ہے۔یہی مجرب علاج اور نسخۂ شافی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ﴾

’’پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس

کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات گگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری''۔(10)

علامہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

''جو اپنی عمارت کو بلند کرنا چاہتا ہے اسے بنیاد مضبوط کرنی پڑے گی کیونکہ عمارت کی بلندی کا تعلق اس کی بنیاد کی مضبوطی سے ہے۔ کمزور بنیاد پر عمارت قائم ہوگی تو گر جائے گی لہذا مومن کو چاہئے کہ اپنی عمارت ایمان کی بنیاد پر رکھے۔ اس لئے مومن کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، پہلا اللہ تعالیٰ کی اس کے اسماء وصفات کے ذریعہ صحیح معرفت اور دوسرا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت''۔(11)

حضرت مالک بن دینارؒ نے فرمایا:

''دنیادار اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ ان کو دنیا کی سب سے لذت دینے والی چیز کا ذائقہ نصیب نہیں ہوا''

پوچھا گیا: وہ کیا ہے؟''

فرمایا:

''اللہ کی معرفت''(12)۔

علامہ ابن قیم کہتے ہیں:

''بندوں کی سعادت وصلاح وفلاح اس میں ہے کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کریں کہ اصل مقصود ومطلوب ہے جس کے بغیر ان کا حال چوپائیوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا''۔(13)

....

(10) التوبہ 109

(11) الفوائد 175

(12) حلية الاولياء: ابو نعيم، 358/2

(13) مختصر الصواعق المرسلة، 47/1

قرآن مجید کی عظیم تر آیت، آیت الکرسی ہے جس میں اللہ کے 6 نام آئے ہیں۔

ام القرآن سورہ فاتحہ کو کہتے ہیں جس میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر ہے۔

سورہ الاخلاص قرآن کی ایک تہائی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس صحابی کو جنت کی بشارت دی تھی جو سورہ اخلاص کو محبت کی بنا پر پڑھا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک صحابی نماز میں ہمیشہ سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے، رسول اکرم ﷺ کو ان کے بارے میں بتایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان سے پوچھو وہ کیوں اس طرح کرتے ہیں''

ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا:

''مجھے اس سورہ سے محبت ہے کیونکہ اس میں اللہ کی صفات کا ذکر ہے''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''انہیں خوشخبری دو کہ اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے'' (14)۔

قرآن مجید میں اسماء الحسنٰی کا ذکر 4 مرتبہ آیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

'' (اے نبی ﷺ) ان سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کیلئے سب اچھے ہی نام ہیں'' ۔(15)

﴿ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

''وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کیلئے بہترین نام ہیں'' ۔ (16)

....

(14) بخاری و مسلم

(15) الاسراء 110

(16) طٰہٰ 8

﴿ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِءُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

''وہ اللہ ہی ہے تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے، اس کیلئے بہترین نام ہیں''۔(17)

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُواْ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَآئِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴾

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے''(18)۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ تمام علوم میں اسمائے حسنیٰ کا علم سب سے افضل و بہتر ہے۔

علامہ ابن عربیؒ کہتے ہیں:

''علم کی فضیلت کا تعلق اس چیز سے ہے جس کے بارے میں معلوم کیا جائے اور اللہ کے اسماء کا علم اس لئے سب سے زیادہ فضیلت والا ہے کیونکہ اس کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے''۔(19)

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا اور ان کا علم حاصل کرنا نیز ان اسماء سے دل لگانا دراصل فلاح تک پہنچانے والا راستہ اور صراط مستقیم ہے۔ انہی اسماء سے راستے کے مسافروں کی عزیمت جوان رہتی ہے اور حوصلے بلند رہتے ہیں۔ مسافر کو راستے میں سنگ میل کی ضرورت ہے اور سنگ میل کے بغیر آدمی سفر نہیں

....

(17) الحشر 24

(18) الاعراف 180

(19) احکام القرآن: علامہ ابن عربی، 804/2

کرسکتا لہذا اصراط مستقیم کے سنگ میل یہی اسمائے حسنیٰ ہیں جو منزل مقصود تک لے جاتے ہیں‘‘۔(20)

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

’’اسمائے صفات کا علم ہدایت کی بنیاد، دلوں کا حاصل، عقل کا محور اور عمل کا محرک ہے‘‘۔(21)

علامہ ابن تیمیہؒ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

’’اللہ کی معرفت، معارف کا حاصل ہے، اس کی عبادت اصل مقصد ہے اور اس تک رسائی اصل مطلوب ہے۔ یہی انبیاء کی دعوت کا خلاصہ اور رسالت کا مغز ہے‘‘۔(22)

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

’’تمام انبیاء کی دعوت تین بنیادی نکات پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تعارف جسے اس کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ پکارا جائے، دوسرا اس تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ جو ذکر، شکر، عبادات اور اس کی محبت پر مبنی ہے اور تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی اور راستے پر چلنے کا نتیجہ بندوں کو بتایا جائے کہ وہ اپنے نیک بندوں کے لئے کتنا عظیم اجر اپنے پاس رکھتا ہے‘‘۔(23)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ﴾

’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں‘‘۔(24)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

....

(20) مدارج السالكين: علامه ابن قيم، 110/1

(21) الفتاویٰ الحموية: علامه ابن تيميه، 196

(22) الفتاویٰ الحموية: ابن تيميه، 199

(23) الصواعق المرسلة: علامه ابن قيم، 1489/4

(24) فاطر 28

''اللہ سے ڈرنے والے لوگ صرف وہی ہیں جو اللہ کا علم رکھتے ہیں کیونکہ علم جتنا گہرا ہوگا اس سے خشیت بھی اتنی ہی ہوگی''(25)۔

قرآن مجید کی بیشتر آیات میں اس علم کے سیکھنے کی اہمیت واضح ہوئی ہے۔ درج ذیل ارشادات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

*''خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے''(26)

*''جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے''(27)

*''جان لو کہ اللہ بردبار اور درگزر کرنے والا ہے''(28)

*''خوب جان رکھو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے''(29)

*''تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے''(30)

اس مفہوم اور معنی کی 30 کے قریب آیات ہیں۔

اسمائے حسنیٰ کا علم دل کو شرک وشک اور شبہات اور بدعات سے پاک کرتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''شریعت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بدنی اعمال کا تعلق قلب سے ہے اور قلبی اعمال بدنی اعمال سے زیادہ اہم ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ مومن اور منافق میں فرق دل ہی تو ہے جبکہ دونوں کی نماز

....

(25) تفسیر ابن کثیر 553/3

(26) البقرہ 231

(27) البقرہ 233

(28) البقرہ 235

(29) البقرہ 244

(30) البقرہ 267

اورعبادات ایک جیسی ہیں‘‘(31)۔

علامہ عزبن عبدالسلام کہتے ہیں:

’’دل جب اللہ تعالیٰ کے صفات کمال وجلال کا مشاہدہ کرتا ہےتو اس کے اندر تزکیہ پیدا ہوتا ہے اور جب اس کے اندر تزکیہ پیدا ہوتو وہ بدن کوحکم دیتا ہے کہ وہ اعمال کئے جائیں جوشان الٰہی کے مطابق ہوں‘‘۔(32)

سلف صالحین میں سے کسی سے پوچھا گیا:

’’کیادل بھی سجدہ کرتا ہے؟‘‘

فرمایا’’ہاں!دل بھی سجدہ کرتا ہےمگر جب وہ سجدہ کرتا ہےتو مرتے دم تک سجدے سےنہیں اٹھتا‘‘(33)۔

اسمائےحسنیٰ کے ذریعہ اللہ کی عبادت کرنے اوراس پرتدبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

’’دل اللہ تعالیٰ کی محبت کیلیئے ہی پیدا ہوا ہے،یہی وہ فطرت ہےجس پراللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ نے اپنی محبت دلوں میں ودیعت کردی ہے،انسان فطرتاً اللہ سے محبت کرتا ہے،فطرتِ انسانی مداخلت کے بغیر رہےتو خودبخود اللہ تک پہنچ جاتی ہے‘‘(34)۔

ایک اورجگہ پرلکھتے ہیں:

’’جس کادل اللہ تعالیٰ کے اسماءمیں سے کسی ایک اسم سے لگ گیا تو وہ اسم اس کا ہاتھ پکڑ کراللہ کی

....

(31) بدائع الفوائد: ابن القیم،193/3

(32) شجرة المعارف: العز بن عبد السلام

(33) التعبد بالاسماء والصفات:ولید الودعان

(34) مجموع الفتاویٰ:ابن تیمیہ،134/10

جناب میں اسے لے جائے گا اور جو اسمائے حسنیٰ کے راستے پر چلا وہ اللہ تعالیٰ تک ضرور پہنچے گا، جس نے اس سے محبت کی وہ یقیناً اس کے اسمائے صفات سے محبت کرے گا'' (35)۔

رسول اکرم ﷺ کی دعا تھی:

اللھم انی اسألک حبک وحب کل من یحبک وحب کل عمل یقربنی الی حبک

''اے اللہ میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں، ہر اس چیز سے محبت کا سوال کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہو اور ہر اس عمل سے محبت کا سوال کرتا ہوں جو تیری محبت سے مجھے قریب کردے'' (36)۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے عجز وانکساری اور تذلل پیدا ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین میں سے کسی نے کہا:

''اللہ تک پہنچنے کے لئے تمام عبادات کے دروازوں پر گیا تو دیکھا ہر دروازے پر لوگوں کی بھیڑ ہے جس کے باعث مجھے دروازہ میں داخل ہونا مشکل ہو رہا تھا اور جب میں عجز وانکساری اور تذلل کے دروازے پر گیا تو دیکھا کہ یہ بڑا وسیع اور کشادہ دروازہ ہے جس پر لوگوں کی بھیڑ نہیں۔ ابھی میں نے چوکھٹ پر قدم ہی رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا اور مجھے اپنے دربار میں لے گیا''۔ (37)

اسمائے حسنیٰ کا علم انسان کے اندر دعا اور قبولیت کی امید پیدا کرتا ہے۔ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے تمام صفات کا یقین رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اللہ غنی ہے کیونکہ فقیر سے نہیں مانگا جاتا، وہ سننے والا ہے کیونکہ بہرے کو نہیں پکارا جاتا، وہ کریم ہے کیونکہ بخیل سے نہیں کہا جاتا، وہ رحیم اور شفیق ہے کیونکہ سنگ دل سے سوال نہیں کیا جاتا، وہ قدرت رکھتا ہے کیونکہ عاجز اور بے بس سے طلب نہیں کیا جاتا۔

....

(35) عدۃ الصابرین: ابن قیم، 286

(36) ترمذی، علامہ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

(37) مدارج السالکین: ابن قیمؒ، 461/1

اللہ تعالیٰ کی معرفت سے اطاعت اور عبادت میں لذت پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ مشکل اور پریشانی کے وقت فرمایا کرتے تھے:

’’اے بلال نماز قائم کر کے ہمیں راحت پہنچاؤ‘‘۔(38)

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

’’بے شک اللہ کے 99 نام ہیں، ایک کم سو، جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔‘‘(39)

عربی متن میں ’’احصاء‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے، احصاء کا مطلب صرف یاد کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انہی ناموں کے توسط سے کرنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں ’’یہی سعادت اور خوش بختی کا اصل الاصول ہے۔‘‘(40)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ سعدیؒ لکھتے ہیں:

’’جنت میں صرف مومنین ہی داخل ہوں گے، ایمان کا سرچشمہ، مصدر ومنبع اور جڑ و بنیاد اسمائے حسنیٰ ہیں اور انہی کی طرف ایمان پلٹ کر آتا ہے‘‘۔(41)

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

’’جسے ابدی سعادت درکار ہو اسے عبودیت کی چوکھٹ سے چمٹے رہنا چاہئے‘‘(42)

علامہ ابونعیم کہتے ہیں ’’احصاء کا مطلب گنتی یاد کرنا نہیں بلکہ عمل اور ایمان ہے۔‘‘

....

(38) ابو داؤد، علامہ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(39) بخاری ومسلم

(40) بدائع الفوائد۔ ابن قیم

(41) التوضیح والبیان۔ علامہ سعدیؒ

(42) مدارج السالک۔ ابن قیم

اللہ کے رسول ﷺ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے محض 99 نام ہیں۔اللہ کے رسول ﷺ کی معروف دعا ہے:

''یا اللہ میں تجھ سے تیرے ہر نام کے واسطے سے سوال کرتا ہوں، جو نام تو نے اپنی ذات کے بیان کئے ہیں یا اپنی کتاب میں نازل فرمادیئے یا اپنے کسی بندے کو بطور خاص سکھا دیئے یا جن ناموں کو تو نے اپنے خزانۂ غیب میں محفوظ رکھا ہوا ہے'' (43)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے کچھ اسماء ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خزانہ غیب میں محفوظ کرر کھا ہے۔

واضح رہے کہ اسماء الحسنٰی کے متعلق اہل علم نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ان علمی مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے ہم آپ کے سامنے وہ چیز پیش کررہے ہیں جن سے افادہ عام کی توقع ہے۔

(جاری ہے)

نوٹ:

یہ موادتقریر کی شکل میں ڈی وی ڈی میں بھی دستیاب ہے۔

....

(43) احمد، ابن حبان اور حاکم۔ حدیث صحیح

اللہ ، الالٰہ

اسماءالحسنٰی میں سب سے پہلے دوناموں پر روشنی ڈالی جارہی ہے وہ یہ ہیں:

''اللّٰہ'' اور **''اَلِالٰہ''**۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّنِیۡ أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكۡرِیۡ ﴾

''میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر'' (1)

''اللہ'' خالق کا خاص اور ذاتی نام ہے جو سب سے بڑا اور جامع ہے۔ یہ اسم تمام اسمائے حسنٰی میں سب سے زیادہ شان والا ہے، اسی لئے اسے اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ مخلوق میں اس جیسا کسی کا نام نہیں، اس لئے اس اسم کی کوئی تشنیہ ہے نہ جمع اور نہ ہی اس کی تانیث (2)۔ یہ اسم اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی جو ازل سے ابد تک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

''انسان کے جملہ اعمال وافعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ ہوں، مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے متحرک بن جائے۔

....

(1) طہٰ 14

(2) تشنیہ دو کو کہتے ہیں مثال کے طور پر کریم کا تشنیہ ہے کریمان، اس کی جمع ہے کرماء اور اس کی تانیث سے مراد اس کا مؤنث جیسے کریمہ۔

دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی زیادہ مرتب، منظّم اور قابل اعتماد ہوگی''(3)۔

اس نام کے مصدر اور اصل کے متعلق علمائے کرام کے درمیان بڑی بحث ہے تاہم اکثریت کا خیال ہے کہ اسم ''اللہ'' کا اصل ''الٰہ'' ہے اور ''الٰہ'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَإِلَـٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴾

''تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں''(4)۔

اس لفظ کا مادہ ''ا ل ہ'' ہے۔ اس مادے سے جو الفاظ لغت میں آتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

☆اَلِہَ : حیران وسرگشتہ ہوا۔

☆الهت الی فلان ای سکنت الیه : اُس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون حاصل کیا۔

☆اله الرجل یاله ، اذا فزع من امر نزل به فالهه غیره ای اجاره : آدمی کسی مصیبت یا تکلیف سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اس کو پناہ دی۔

☆اله الرجل الی الرجل ای اتجه الیه لشدة شوقه الیه : آدمی نے دوسرے کی طرف شدتِ شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

....

(3) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

(4) البقرہ163

☆اله الفصيل اذا ولع بامه : اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہیں اس سے چمٹ گیا۔

☆لاہ یلیہ لیھا و لاھااذا احتجبت : پوشیدہ و مستور ہوا۔(5)

انسان کے ذہن میں عبادت کیلئے اولین تحریک اپنی حاجت مندی سے پیدا ہوتی ہے، وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کرسکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ اس کی حاجت پوری کرسکتا ہے۔

اسے اپنے سے بالاتر سمجھے، نہ صرف رتبے کے اعتبار سے بالاتر سمجھے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی بالادستی کا قائل ہو۔

اس کی طاقت، حاجت روائی اور اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔

اس کی طرف انسان کا اشتیاق سے توجہ کرنا۔(6)

قرآن مجید میں اسم ''اللہ'' 2602 مرتبہ آیا ہے(7)۔

تمام اسماء میں یہ نام سب سے زیادہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔سورہ الحشر کی آخری آیات، آیت الکرسی اور سورہ المجادلہ کی ایک دو آیات کے علاوہ ہر ہر آیت میں یہ اسم مذکور ہے(8)۔

''اللّٰــــہ'' عربوں کے لئے اجنبی لفظ نہیں تھا۔قدیم زمانوں سے وہ خالق کائنات کیلئے یہی لفظ استعمال کرتے تھے اور اپنے دوسرے معبودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لئے ان کے ہاں '' اللہ'' کا لفظ رائج تھا۔

یہ اسم علم، خاص اور جامد ہے جس کا کوئی اشتقاق نہیں۔تمام اسمائے حسنیٰ اپنے معانی اور مفہوم کے

....

(5)الاسماء الحسنیٰ، ازمولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترتیب: عبدالوکیل علوی، ص33۔

(6)قرآن کی 4 بنیادی اصطلاحات، ازمولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص15 تا18۔

(7)الجامع لاسماء الله الحسنیٰ، حامد احمد الطاهر

(8)الاسنی ، الامام القرطبی، ص273

اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے تین ناموں پر مبنی ہیں:

اللہ، الرب اور الرحمٰن۔

انہی تینوں ناموں میں باقی تمام نام سموئے ہوئے ہیں۔

اسم " اللّٰه "، میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ الوہیت موجود ہے۔

اسم الرب میں صفاتِ ربوبیت ہے جبکہ اسم الرحمٰن میں جود واحسان اور بر پنہا ہے۔ یہ تینوں نام سورۃ الفاتحہ میں جمع کیے گئے ہیں(9)۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ "الرحمٰن، الرحیم، الخالق، العزیز" اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں، یہ نہیں کہا جاتا کہ "اللہ" الرحمٰن الرحیم کا نام ہے(10)۔

اس نام کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام اسمائے حسنیٰ کا اصل ہے اور تمام اسمائے حسنیٰ اس نام سے وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا ﴾

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو"(11)۔

﴿ اللَّهُ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

"وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کیلئے بہترین نام ہیں"(12)۔

﴿ قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

....

(9)مدارج السالکین، الامام ابن القیم

(10)فقه الاسماء الحسنی، عبد الرزاق عبد المحسن البدر، ص90

(11)الاعراف180

(12)طه 8

''اے نبی ﷺ! ان سے کہہ دو، اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کیلئے سب اچھے ہی نام ہیں'' (13)۔

اس اسم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام اسمائے حسنٰی میں الف اور لام ہونے کی صورت میں حرف ندا داخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر الرحمٰن، القدوس میں جب حرف ندا داخل کیا جائے تو یا رحمٰن، یا قدوس کہا جائے گا، یعنی الف اور لام حذف ہوگا جبکہ اللہ میں حرف ندا داخل ہوتا ہے جیسے ''یا اللہ''۔

اس مبارک نام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر مسنون اذکار میں اسی نام کا استعمال کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر ''**سبحان الله، الحمد لله، الله اكبر، لاحول ولا قوة الا بالله**''۔

اس کی خصوصیات میں سے ہے کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر اس دنیا کے آخر انسان تک کسی کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسم کرے۔ جاہلیت کے تاریک ترین دور میں بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ نام خالق و مالک کائنات کا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴾

''اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے'' (14)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نام (اللہ) کو کافروں اور طاغوتوں کے دلوں سے محو کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو اس سے منسوب کریں۔

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں ''تمام اسمائے حسنٰی سے اس اسم کو کچھ خصوصیتیں حاصل ہیں: اول یہ کہ ''اللہ'' تمام ناموں کی ابتدا ہے، دوم یہ کہ یہ تمام ناموں میں سے عظیم تر ہے، سوم یہ کہ معانی

....

(13) الاسراء 110

(14) لقمان 25

اور مفہوم کے اعتبار سے سب سے زیادہ جامع ہے، چہارم یہ کہ اس نام کے معانی اور مفہوم بے حد وحساب ہیں، پنجم یہ کہ یہ اللہ کا ذاتی نام ہے جبکہ باقی تمام اسماء اس کی صفات ہیں، ششم یہ کہ عقلی اور شرعی اعتبار سے اس نام کا تعلق خاص اللہ تعالیٰ سے ہے۔ ہفتم یہ کہ کسی مخلوق کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرے، ہشتم یہ کہ ہر کام میں برکت کے حصول کے لئے اسے استعمال کیا جاتا ہے، نہم یہ کہ تمام امتوں میں معروف تھا اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور دہم یہ کہ جب یہ نام زمین سے اٹھ جائے گا تو قیامت برپا ہو جائے گی (15)۔

امام قرطبیؒ کہتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ قیامت برپا کرنا چاہے گا تو زمین میں بسنے والے تمام مومنین کی روحوں کو قبض کرلے گا اور زمین میں باقی رہنے والے فاسقوں اور کافروں کی زبانوں سے یہ نام ''اللہ'' چھین لے گا، اس وقت قیامت برپا ہوگی'' (16)۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ: اَللّٰه اَللّٰه

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں کوئی ''اللہ، اللہ'' کہنے والا نہیں رہے گا'' (17)۔

علامہ رازی کہتے ہیں:

اس مبارک نام ''اللہ'' کو جو خصوصیتیں حاصل ہیں وہ کسی دوسرے نام کو حاصل نہیں۔ کلمہ شہادت

....

(15) الاسنی، الامام القرطبی، ص 278

(16) الاسنی، الامام القرطبی، ص 275

(17) حدیث صحیح: بروایت حضرت انس بن مالکؓ، دیکھئے: مسلم 148، احمد 12043، ترمذی 2207۔

جس کے ادا کرنے سے آدمی کفر سے اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ اس نام کے بغیر ادا نہیں ہوتا۔ اگر آدمی ''اشھد ان لا الــه الا الـرحـمن، الرحیم، وغیر کہے تو وہ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ ''اشھد الا اله الا الله'' نہ کہے''(18)۔

اسم اللہ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اس میں سے حرف کم کردیئے جائیں تو اس کا مفہوم تبدیل نہیں ہوتا:

''الف'' نکال دیا جائے تو ''للّٰہ'' ہوگا۔

ایک '' لام'' نکال دیا جائے تو ''اله'' ہوگا۔

دونوں ''لام'' نکال دیئے جائیں تو ''ھو'' رہ جاتا ہے۔ اور ''ھو'' کا مخرج سینے سے ہے(19)۔

اسم اللہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہی اول اور آخر مطلوب ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُولُوا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

''مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الــه الا الـلــه نہیں کہتے''(20)۔

ایک اور جگہ پر اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ مَاتَ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه دَخَلَ الْجَنَّة

''جو اس یقین کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ

---

(18)مفاتیح الغیب، الامام الفخر الرازی

(19)الاسنی، الامام القرطبی، ص280

(20)حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوہریرہ، دیکھئے: مسلم 21، بخاری 2946

جنت میں داخل ہوگا'' (21)۔

جس کام کی ابتدا میں یہ نام نہ لیا گیا ہو وہ بے برکت اور جڑ کٹا ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا يَبْدَأُ فِيْهِ بِذِكْرِ اللّٰه فَهُو اَبْتَر

''ہر وہ اہم کام جس کی ابتدا میں اللہ کا ذکر نہ کیا گیا ہو تو وہ جڑ کٹا ہے'' (22)۔

اس نام کا ذکر کم پر کیا جائے تو وہ بڑھ جاتا ہے، خوف میں کیا جائے تو امن مل جاتا ہے، مشکل و مصیبت میں لیا جائے تو اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، تنگی میں لیا جائے تو کشادہ ہو جاتی ہے، غم راحت میں تبدیل ہو جاتا ہے، ذلت عزت میں بدل جاتی ہے اور فقر غنا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نام ہے جس سے برکتوں کا حصول ہوتا ہے، دعائیں قبول ہوتی ہیں اور بلائیں ٹل جاتی ہیں۔

ہم اپنی دعاؤں میں عموماً ''اللّٰھم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟۔

علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ **اللّٰھم** کا مطلب ''یا اللہ'' ہے۔ یہ صیغہ صرف طلب کرنے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے نام کے لئے مستعمل نہیں (23)۔

اللہ تعالیٰ کے ان دو (**اللہ** اور **الالہ**) مقدس اور بابرکت ناموں کے معانی و مفہوم جاننے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ اس حوالے سے مختلف علماء نے مختلف فوائد کا ذکر کیا ہے، چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

''اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اخلاق احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ

....

(21) **حدیث صحیح**: براویت حضرت عثمان بن عفانؓ، دیکھیئے: مسلم 26، نسائی 10888 تاہم امام نسائی اس کی سند پر کلام کیا ہے۔

(22) امام بیہقی نے سنن الکبری میں 3/209 اور 8/330 میں نیز امام طبرانی الکبیر 72/19 میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے، علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد 2/3148 میں بھی نقل کیا اور فرمایا: اس کے رواۃ میں صدقہ بن عبد اللہ ہے جسے امام احمد، بخاری، مسلم اور دیگر نے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ اسی راوی کو ابو حاتم اور دحیم نے ثقہ کہا ہے۔

(23) **الجامع لاسماء اللہ الحسنیٰ، حامد احمد الطاھر**، ص 15

اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ہیں، کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، رسولوں پر اس لئے ایمان کے وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا دن ہے، فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقرر کیا ہے، حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں۔ یہ تمام ایمانیات دراصل ایمان باللہ پر قائم ہیں۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخرت، نہ رسول اتباع کے مستحق ہیں نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہ جاتا'' (24)۔

''اسلام کا نظریہ ہے کہ:

1) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اسے چلا رہی ہے۔

2) اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس کے احکام کے مطابق وسیع کائنات کی تدبیر کر رہی ہیں۔

3) انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی علم و جہالت دونوں کا اس کے اندر اجتماع ہے، غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے اس کی پیروی انسان کرنے لگتا ہے۔

4) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کا خالق خود بنی نوع انسان ہی میں سے ایک بہتر آدمی کو انتخاب کرتا ہے اور اس کو صحیح علم عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کر دیتا ہے۔

5) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسؤل ہستی نہیں۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لئے اپنے

....

(24) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ایک دن اس کو ذرے ذرے کا حساب دینا ہوگا اور اپنے اعمال کے اچھے یا برے نتائج دیکھنے ہوں گے‘‘(25)۔

’’ایمان اپنے اندر زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے۔عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا وہاں اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین، پیغمبر اسلام ﷺ کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کرسکتا ہے نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم‘‘(26)۔

اللہ تعالیٰ کے ان دو مذکورہ ناموں کا علم حاصل کرنے سے ہمارے اندر وسعتِ نظر پیدا ہوگی۔ایمان باللہ کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویائے نظر کو اتنا وسیع کردیتا ہے اللہ تعالیٰ کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے۔انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے اعتبار سے دیکھتا ہے اس کی نگاہ اس تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے جس میں اس کی اپنی قدرت، اس کا اپنا علم اور اس کے اپنے مطلوبات محدود ہیں۔اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر ٹھہر جاتی ہے۔اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے۔اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

ایمان باللہ انسان کو پستی اور ذلت سے اٹھا کر خودداری اور عزتِ نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔جب تک اس نے اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا تھا دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا ہر ضرر پہنچانے والی

....

(25)اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، از مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ

(26)ایضا

چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا، اس سے خوف کھاتا تھا، اس کے آگے ہاتھ پھلاتا تھا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا مگر جب اس نے اللہ کو پہچانا تو معلوم ہوا جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں، جن کی بندگی وہ کر رہا تھا وہ سب اسی طرح کے بندے ہیں۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے میں خود انکساری کے ساتھ عزتِ نفس اور خشوع وخضوع کے ساتھ ہم رشتہ ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی طاقت کے سامنے بالکل بے بس ہوں۔

خالق اور مخلوق کے تعلق کی صحیح معرفت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان سے ان تمام غلط توقعات اور جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے جو عدم معرفت کا نتیجہ ہے اور انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ ان کیلئے اعتقادِ صحیح اور عملِ صالح کے سوا فلاح ونجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔

ایمان باللہ انسان میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکست دلی سے معلوم نہیں ہوتی۔ مومن کیلئے ایمان امیدوں کا ایک لازوال خزانہ ہے جس سے قوتِ قلب اور تسکینِ روح کی دائمی اور غیر منقطع رسد اس کو پہنچتی رہتی ہے۔

یہی رجائیت، صبر اور استقامت اور توکل علی للہ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتی ہے جہاں مومن کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہوجاتا ہے اور ساری دنیا کی مشکلیں، دشمنیاں، تکلیفیں، مضرتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

ایمان باللہ سے غیر معمولی طور سے جرأت اور بسالت اور شجاعت اور شہامت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو 2 چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان، اپنے اہل وعیال، اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض الہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

ایمان باﷲ انسان کے دل سے حرص وہوس اور شک وحسد کے وہ رکیک جذبات بھی دور کر دیتا ہے جو اس کو جلد منفعت کیلئے ذلیل اور ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر ابھارتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کے درمیان فساد برپا کراتے ہیں۔

ایمان باﷲ سے تمدن کو فائدہ پہنچتا ہے، اس سے انسانی جماعت کی افراد میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور عمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔

ان فوائد کے حصول کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے:

☆ شعوری ایمان کا حصول

رسمی اور موروثی ایمان کو شعوری ایمان میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہماری عام حالت اس وقت یہ ہے کہ ہمارے ایمان کی بنیاد کسی گہرے شعوری اور یقین پر نہیں۔ ہم بے شک اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں ، اسے علیم وحکیم، حاکم اور معبود تسلیم کرتے ہیں لیکن زیادہ تر صرف اس لئے کہ جن گودوں میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور جس ماحول میں ہماری پرورش ہوئی ہے وہاں اسے ایسا ہی مانا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایمان میں شعوری کیفیت اور بصیرت کیسے پیدا ہوسکتی ہے، اس کیلئے قرآن وسنت کا متعین کیا ہوا طریقہ موجود ہے جو مکمل اور فطری طریقہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دوسرے نامتوازن، نامکمل اور ناقص طریقوں کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

☆ لوازم صفات کا تفصیلی علم:

بیداریٔ علم کے سلسلے میں دوسری ضروری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات خصوصاً اس کی صفتِ توحید کے تقاضوں سے پوری واقفیت حاصل کی جائے، اس واقفیت کے بغیر ایمان میں وہ جامعیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

☆ذ کرِ دائمی:

اللہ تعالیٰ کی دائمی یاد علمی اور عقلی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور ان صفات کے لوازم کی صحیح معرفت پیدا کرنے کی مذکورہ بالا دونوں کوششیں بیداریٔ ایمان کی محض ابتدائی تدبیریں ہیں۔ اگر کوئی شخص انہی پر اپنی کوششوں کو ختم کردے تو یہ ناکافی ہے۔

☆محبتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی محبت اور پورے ذوق وشوق کے ساتھ اس کی رضا جوئی: ایمان باللہ کا صحیح معنوں میں ایمان باللہ بن جانا کیوں ناممکن ہے اور محبّ بننے کیلئے کیوں ضروری ہے، اس کے 2 اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس تعلق کی بنا پر جو اس کے اور انسان کے مابین ہے اس بات کا مستحق ہے کہ انسان کی اصلی محبت صرف اسی کیلئے ہو۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بندگی کے اس بھاری عہد کا جو انسان نے اپنے رب سے باندھ رکھا ہے، بوجھ صرف وہی اٹھا سکتا ہے جس میں محبتِ الٰہی کا جوہر موجود ہو۔

ہم اللہ تعالیٰ کے دو بابرکت نام ''اللہ اور الالہ'' کے معانی اور مفہوم اور ان ناموں کا علم حاصل کرنے کے فوائد کے حوالے سے اپنے فہم کے مطابق روشنی ڈال رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دو بابرکت ناموں کے حوالے سے جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے، ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دیگر بابرکت ناموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الرب

محکم تنزیل میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيّاً ﴾

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟'' (1)۔

علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''الرب'' اسماء الحسنٰی میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں مختلف صیغوں میں اس کا استعمال ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴾

''کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے'' (2)۔

اسی طرح سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا:

﴿ وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً ﴾

....

(1) مریم 65

(2) سباء 26

''اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہے گا کہ اے میرے رب، ! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا'' (3)۔

اور سورہ الناس میں ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾

''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی'' (4)۔

"**الرب**" مادہ" ر ب ب " سے نکلا ہے جس کا اساسی مفہوم ''پرورش'' ہے۔اسی سے تصرف،خبر گیری اور اصلاحِ حال کا مفہوم پیدا ہوا،اسی کی بنیاد پر فوقیت، بالادستی،سیادت اور آقائیت کے مفہوم نکلے۔

ربیب اس لڑکے کو کہتے ہیں جو کسی کے گھر میں پرورش پائے۔رابہ سوتیلی ماں کو اور راب سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔

سمیٹنے اور جمع کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے:

فلان یرب الناس

کا مطلب ہے کہ فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے۔

خبر گیری کرنے، اصلاحِ حال کرنے، دیکھ بھال اور کفالت کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ابوسفیان نے صفوان سے کہا تھا:

"**لان یربینی رجل میں قریش احب الی من ان یربینی رجل میں ھوازن**"

''قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی سرپرستی میں لے لے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ کوئی ہوازن کا آدمی ایسا کرے''۔

....

(3) الفرقان 30

(4) الناس 1

امارات اور کویت میں ”رب العمل “کفیل کے لئے بولا جاتا ہے۔اسی مفہوم میں وہاں کفیل کیلئے
”ارباب“ کا لفظ مستعمل ہے۔

فوقیت، بالا دستی،سرداری اور حکم چلانے کے لئے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

”قد رب فلان قومه“ کا مطلب ہے کہ فلاں نے اپنی قوم کو اپنا تابع بنالیا۔

بحری جہاز کے کپتان کو ربان کہتے ہیں۔

مالک کو بھی رب کہتے ہیں۔

ابرہہ جب کعبہ ڈھانے مکہ مکرمہ آیا تھا تو اس کے آدمیوں نے عبدالمطلب کے کچھ اونٹ پر قبضہ کرلیا،عبدالمطلب ابرہہ کے پاس گیا اور اپنے اونٹ واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔اس پر ابرہہ نے کہا کہ میں تمہارا کعبہ ڈھانے آیا ہوں،تم اپنی قوم کے سردار ہو،میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے سفارش کرنے آئے ہو کہ میں کعبہ کو نہ ڈھاؤں مگر تم تو اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنے آئے ہو جبکہ تمہیں کعبہ کی کوئی فکر نہیں؟۔

اس پر عبدالمطلب نے جواب دیا:

”اَمَّا الْاِبِل فَاَنَا رَبُّهَا وَاَمَّا الْكَعْبَةُ فَلَهَا رَبٌّ يَحْمِيْهَا “

”اونٹ کی واپسی کا مطالبہ اس لئے کر رہا ہوں کہ میں ان کا رب (مالک) ہوں جبکہ رہا معاملہ کعبے کا تو اس کا ایک رب (مالک) ہے جو خود ہی اس کی حفاظت کرے گا“۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رب کا مطلب ہے:

1) پرورش کرنے والا،ضروریات بہم پہنچانے والا،تربیت کرنے والا اور نشو ونما دینے والا۔

2) کفیل،خبرگیر،دیکھ بھال اور اصلاحِ حال کا ذمہ دار۔

3) وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس میں متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں۔

4) سید مطاع،سردار ذی اقتدار،جس کا حکم چلے،جس کی فوقیت اور بالا دستی تسلیم کی جائے۔

5) مالک، آقا۔(5)۔

قرآن مجید میں درج بالا معانی میں اس کے متعدد استعمالات ہوئے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿ قَالَ مَعَاذَ اللّهِ إِنَّهُ رَبِّیْ أَحْسَنَ مَثْوَایَ ﴾

''اس نے کہا خدا کی پناہ، وہ تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا''(6)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا:

﴿ قَالَ أَفَرَأَیْتُم مَّا کُنتُمْ تَعْبُدُونَ ،أَنتُمْ وَآبَاؤُکُمُ الْأَقْدَمُونَ ، فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ ، الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ، وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ، وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ، وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ، وَالَّذِیْ أَطْمَعُ أَن یَغْفِرَ لِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾

''ابراہیمؑ نے کہا: کبھی تم نے آنکھیں کھول کر ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے، میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے''(7)۔

ان دونوں مقامات میں رب بمعنی اول اور دوم ''پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت کرنے والا اور نشوونما دینے والا'' استعمال کیا گیا ہے۔

....

(5) قرآن کی 4 بنیادی اصطلاحات، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مع تصرف

(6) یوسف 23

(7) الشعراء 75، 82

رب بمعنی سوم ''وہ جومرکزی حیثیت رکھتا ہوجس میں متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں'' سورہ ہود کی درج ذیل آیت میں ملاحظہ ہو، جب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اب تو بس تم وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہوتو اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ وَلاَ يَنفَعُكُمْ نُصْحِيَ إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

''اب اگر میں تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جبکہ اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کرلیا ہو، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے'' (8)۔

چوتھے معنی کو واضح کرنے کیلئے ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ ﴾

''کہو: اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بنائے'' (9)۔

درج بالا آیت میں چوتھا مفہوم ''سید مطاع، سردار ذی اقتدار، جس کا حکم چلے، جس کی فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے'' واضح ہوا ہے۔

پانچویں مفہوم ''مالک اور آقا'' کو واضح کرنے والی آیات میں سے ایک یہ ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴾

....

(8) ہود 34

(9) آل عمران 64

''اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا، پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں'' (10)۔

توحید کی تین قسموں میں سے ایک قسم ''توحید ربوبیت'' ہے (11)۔ ربوبیت دو بنیادوں پر قائم ہے، ایک تخلیق میں اللہ کی توحید، دوسرا تدبیر میں اس کی توحید۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس حقیقت کو انتہائی مختصر فقروں میں واضح کر دیا۔

فرعون نے کہا:

﴿ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَى ﴾

''تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ''

﴿ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىٓ أَعْطَى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى ﴾

''(موسی نے) جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا'' (12)۔

درج بالا آیت مبارکہ میں انتہائی مختصر جملوں میں توحید ربوبیت کی حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ رب سبحانہ وتعالی وہ ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت پر پیدا کیا اور پھر اس کی تدبیر بھی کرتا ہے۔

اس مبارک اسم میں عطا اور رجائیت ہے، یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالی نے اس نام کے ذریعہ اپنی مدح اور تعریف کی ہے۔ درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

....

(10) الانبیاء 22

(11) توحید کی تین اقسام یہ ہے: توحید الوہیت، توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات۔

(12) طٰہ 49، 50

﴿ الْحَمْدُ للّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾

''تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے''(12)۔

﴿ قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبّاً وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ﴾

''کہو: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے''(13)۔

﴿ اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾

''اللہ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرش عظیم کا رب ہے''(14)۔

﴿ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيّاً ﴾

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان اور زمین کے درمیان ہیں، پس اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟''(15)۔

﴿ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴾

''(موسیٰ نے کہا) تمہارا رب بھی ہے اور تمہارے ان آباء واجداد کا رب بھی ہے جو گزر چکے ہیں''(16)۔

انبیاء اور صالحین کی جو دعائیں قرآن مجید میں نقل ہوئی ہیں ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اسی نام سے دعا کی ہے:

حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کی دعا دیکھئے:

....

(12) الفاتحہ 2

(13) الانعام 164

(14) النمل 26

(15) مریم 65

(16) الشعراء 26

﴿ قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾

''وہ دونوں بول اٹھے: اے ہمارے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے'' (17)۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾

''میرے رب، مجھے اور میرے والدین کو اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے'' (18)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی مبارک نام کے ذریعہ دعا کرتے ہیں:

﴿ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلأَخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ﴾

''اے میرے رب، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے'' (19)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ملاحظہ کیجئے:

﴿ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِن تَأْوِيْلِ الأَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّيْ فِي الدُّنُيَا وَالآخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِماً وَأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ ﴾

''اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا، زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار

....

(17) الاعراف 23

(18) نوح 28

(19) الاعراف 151

مجھے صالحین کے ساتھ ملا'' (20)۔

سرکار دو جہاں، نبی اکرم ﷺ کی بہت سی دعائیں منقول ہیں، آپ ﷺ نے بھی اکثر و بیشتر اسی مبارک اسم کے ذریعہ دعائیں فرمائی ہیں، بطور نمونہ صرف ایک دعا نقل کی جارہی ہے:

''اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ، لاَ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ......''

''اے اللہ تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی الہ نہیں''۔

ائمہ لغت نے رب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''ھُوَ الَّذِیْ اَنْشَاءَ الشَّیْءَ حَالاً فَحَالاً اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ''

''رب وہ ہے جو کسی چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر اس کو پایہ کمال تک پہنچاتا ہے''۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

''اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جود ہوگا اور احسان ہوگا لیکن وہ بات نہیں ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کیلئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل سامان ہوتا رہے نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا'' (21)۔

مجازی ربوبیت کی مثال ماں کی مامتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی بھی قوتیں سب کی سب پرورش کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت وشفقت، حفاظت ونگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک بچہ اپنے جسم وذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔

....

(20) یوسف 101

(21) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزادؒ، ص 35

’’چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو‘‘(22)۔

’’پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کی پرورش کے اصول واحوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح سے پالے اور پوسے جا رہے ہیں‘‘(23)۔

’’دنیا کی کونسی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کرسکتی ہے جسے ماں کی ممتا کہتے ہیں۔ جس بچے کی پیدائش اس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی، اس کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ سن بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا وہ اپنے لئے نہیں بلکہ بچے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ لیکن دیکھو، کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آجائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے، اس لئے یہ کہ نظام ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا متقاضی یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو، اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبہ محبت میں رکھ دیا تھا، جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی، اب اس کا باقی

....

(22) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد، ص 36

(23) ایضاً، ص 40

رہنا ماں کیلئے بوجھ اور بچے کے لئے رکاوٹ ہوتا ہے'' (24)۔

ارشاد ربانی ملاحظہ کیجئے:

فرعون نے کہا:

﴿ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَى ﴾

''تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ''

﴿ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْ أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى ﴾

''(موسی نے) جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا'' (25)۔

''ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کا محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا کا سرچشمہ کہاں ہے؟'' (26)۔

جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف ہمارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہوسکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے:

....

(24) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزادؒ

(25) طہٰ 49، 50

(26) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد، ص 44

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

''لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے'' (27)۔

جس رب العالمین نے ہماری پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کیا ممکن ہے کہ اس نے ہماری روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون، کوئی قاعدہ اور کوئی نظام مقرر نہ کیا ہو، جس طرح ہمارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح ہماری روح کی بھی ضرورتیں ہیں، کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشو ونما کیلئے تو اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن روح کی نشو ونما کے لئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اسی طرح ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کیا گیا۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جائے اتنی ہی قیمتی اور با مقصد بھی ہوتی ہے۔ انسان کرہ ارضی کی بہترین مخلوق اور سلسلہ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی و معنوی نشو ونما کے لئے فطرت کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چندروزہ زندگی کیلئے ہی بنایا گیا ہو:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں؟ پس بالا و برتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی کوئی خدا اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا'' (28)۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ رب کا لفظ استعمال کر کے اس کی عبادت کی دعوت دی گئی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ...... ﴾

....

(27) البقرہ 21، واضح رہے کہ یہ ترجمہ تفہیم القرآن، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے لیا گیا ہے۔

(28) المومنون 115، 116

”لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا خالق ہے“(29)۔

ہمارا رب جو اتنا شفیق اور مہربان ہے، کیا وہ ہمیں سزا بھی دیگا؟۔اس حوالے سے ایک لطیف روایت ملاحظہ کریں:

راوی کہتے ہیں:

”ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے ہوئے تھے کہ ہمارا گزر کچھ لوگوں سے ہوا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا ”تم کون ہو“ انہوں نے جواب دیا ”ہم مسلمان ہیں“ ان میں سے ایک عورت تھی جو لکڑیاں جلائے کچھ پکا رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کا شیر خوار بیٹا بھی تھا۔وہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

کیا آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں؟۔

آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا، پھر اس نے کہا:

”میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، کیا اللہ تعالی ارحم الراحمین نہیں“۔

آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں“۔

عورت نے کہا:

”کیا اللہ تعالی اپنے بندوں پر ماں سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں“۔

آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں“

عورت نے کہا:

”مگر ماں تو اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی“۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

....

(29)البقرہ21

’’اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں میں سے صرف سرکشوں اور باغیوں کو ہی آگ میں ڈالتا ہے‘‘(30)۔

اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھئے:

﴿ مَّا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِراً عَلِيماً ﴾

’’آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے، اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو، اللہ بڑا قدر دان اور سب کے حال سے واقف ہے‘‘(31)۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’شکر کے اصل معنی اعتراف نعمت یا احسان مندی کے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خوامخواہ تمہیں سزا دے۔ صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے، انہی تینوں چیزوں کا نام شکر ہے‘‘(32)۔

قارئین کرام!

اب تک جو بحث کی گئی وہ رب بمعنی اول، دوم اور سوم کی گئی تھی، اب ربوبیت بمعنی چہارم اور پنجم پر بحث کرتے ہیں۔

ان دونوں معانی کو واضح کرنے کیلئے ہمیں فرعون اور نمرود کی مثال دینی ہوگی جنہوں نے ربوبیت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ یہ بات ہمارے ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ فرعون اور نمرود بھی اللہ کو رب مانتے تھے۔ ان

....

(30) مشکوٰۃ 2316 اور العلل 3/185، بعض محدثین نے اسے ضعیف اور بعض نے بے اصل کہا ہے۔

(31) النساء 147

(32) تفہیم القرآن 1/412

کے نزدیک پالنے والا، پرورش کرنے والا، کفیل، خبر گیر اور اصلاح حال کا ذمہ دار اللہ ہی تھا اور اس معنی میں وہ اسے رب بھی مانتے تھے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَآجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رِبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللّهُ الْمُلْكَ ﴾

''کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا، جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اور اس کی بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی''۔

﴿ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ﴾

''جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے''۔

﴿ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾

''ابراہیم نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا''

﴿ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ﴾

''یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا'' (33)۔

نمرود ایسی احمقانہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمین وآسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے۔ اس کا دعوی یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں یا رب السماوات والارض ہوں بلکہ اس کا دعوی صرف یہ تھا کہ میں اس مملکت کا رب ہوں چنانچہ میرا کہا مانا جائے، میرے قانون کی پیروی کی جائے، میری اطاعت کی جائے اور میری فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے۔

فرعون کا حال بھی کم وبیش نمرود کی طرح ہے کہ وہ اللہ کے وجود سے منکر نہ تھا بلکہ وہ صرف خو کو رب بمعنی چہارم اور پنجم قرار دیتا تھا۔ فرعون کے حوالے سے یہ معنی اس وقت واضح ہوتے ہیں جب ایک

....

(33) البقرہ 258

مومن بندہ فرعون کے دربار میں کہتا ہے:

﴿ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلاً أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ وَإِن يَكُ كَاذِباً فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن يَكُ صَادِقاً يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾

''اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اٹھا: کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا، اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آ جائیں گے، اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو''۔

﴿ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِن بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا ﴾

''میری قوم کے لوگو آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین پر تم غالب ہو لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے''۔

آل فرعون کا مرد مومن مزید کہتا ہے:

﴿ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ، يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴾

''اے قوم! مجھے ڈر ہے کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا''۔

﴿ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ، يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا

مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ، مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾

''وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا: اے میری قوم کے لوگو، میری بات مانو، میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں، اے قوم، یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، ہمیشہ قیام کی جگہ آخرت ہی ہے، جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہوگی، اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا'' (34)۔

مذکورہ بالا آیات دراصل وہ خطبہ ہے جو اس مردمومن نے فرعون کے سامنے دیا تھا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون بھی جانتا تھا کہ خالق و مالک دراصل اللہ تعالی ہی ہے، اس نے خودکو رب اس بنا پر قرار دیا تھا کہ وہ مصر کا مالک ہے چنانچہ اس کا کہا مانا جائے، اس کی اطاعت کی جائے، اس کی فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے۔

اسی طرح قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کے اقوام اللہ کو پرورش کرنے والا، کفیل، خبرگیر اور اصلاح حال کا ذمہ دار مانتے تھے۔

قوم نوح کی مثال ہمارے سامنے ہے:

﴿ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاء اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴾

''اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے: یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے، اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا، یہ بات تو

....

(34) مومن 28 تا 40

کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)''(35)۔

کیا یہ خطاب ان لوگوں سے ہوسکتا ہے جو سرے سے اللہ کے وجود کے منکر ہوں؟۔حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا:

﴿ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً ﴾

''میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے''(36)۔

قوم اللہ کے وجود کی منکر نہ تھی تبھی تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ اپنے رب سے معافی مانگو، ہاں قوم اس بات پر مصر تھی کہ اللہ رب العالمین ہے مگر دوسرے بھی خدائی انتظام میں دخل رکھتے ہیں:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدّاً وَلَا سُوَاعاً وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْراً ﴾

''ان کے سرداروں اور پیشواؤں نے کہا: لوگو! اپنے الھوں کو نہ چھوڑو، ودا اور سواع اور یغوث ویعوق اور نسر کو نہ چھوڑو''(37)۔

یہی مثال قوم عاد کی بھی ہے:

﴿ قَالُواْ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴾

''انہوں نے جواب دیا: کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہم بس اکیلے اللہ ہی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے''(38)۔

....

(35)المومنون 24

(36)نوح 10

(37)نوح 23

(38)الاعراف 70

یہی تصورقوم ثمود میں بھی ملتا ہے:

﴿ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ، إِذْ جَاءتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاء رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴾

''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ تمہاری پیروی سے منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ عاد اور ثمود کو جو سزا ملی تھی ویسی ہی ایک ہولناک سزا سے میں تمہیں ڈراتا ہوں، جب ان قوموں کے پاس ان کے پیغمبر آگے اور پیچھے سے آئے اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا کہ ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہذا تم جو کچھ لے کر آئے ہو اسے ہم نہیں مانتے'' (39)۔

﴿ قَالُواْ يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوّاً قَبْلَ هَـذَا أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴾

''انہوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری بڑی امیدیں تم سے تھیں، کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے، تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے'' (40)۔

اسی سے ملتا جلتا تصورقوم لوط علیہ السلام کا بھی ہے، قوم کا جرم انکار الوہیت و ربوبیت نہ تھا بلکہ اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور قانون کی پیروی سے انکاری تھے:

﴿ وَلُوطاً إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ، أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ

....

(39) حم سجدہ 13، 14

(40) ہود 62

قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴾

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا تم لوگ وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو، تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو'' (41)۔

رب کے بارے میں قوم شعیب کے تصورات دیکھئے، قوم شعیب کو تو ان کے رسول نے خطاب کرتے ہوئے ''اگر تم مومن ہو'' کہا:

﴿ وَيَا قَوْمِ أَوْفُواْ الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْيَاءهُمْ وَلاَ تَعْثَوْاْ فِي الأَرْضِ مُفْسِدِينَ ، بَقِيَّةُ اللّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَمَا أَنَاْ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ، قَالُواْ يَا شُعَيْبُ أَصَلاَتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاء ﴾

''اے برادران قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپو اور تولو، لوگوں کو ان چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو، اللہ کی عنایت سے کاروبار میں بچت ہو وہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تمہارے اوپر کوئی نگہبان نہیں، انہوں نے جواب دیا: کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں'' (42)۔

یہود و نصاریٰ کو تو قرآن ''اہل الکتاب'' کہتا ہے، ان کا جرم یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اللہ کو اپنا رب ماننے سے انکاری ہوں۔ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے بزرگ ہستیوں کو خدائی کے مرتبے پر پہنچا دیا

....

(41) العنکبوت 28، 29

(42) ہود 85، 87

اوران کی پرستش کرنے لگے:

﴿ اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ ﴾

''انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو بھی اپنا رب بنالیا'' (43)۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دراصل نجران کے نصاری پر اتری تھی۔ اس پر حضرت عدیؓ بن حاتم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

''نصاری نے اپنے علماء اور مشائخ کو کبھی اپنا رب نہیں بنایا''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء اور مشائخ جس چیز کو حلال قرار دیتے تھے، تم اسے حلال سمجھتے اور چیز کو حرام قرار دیتے تھے تم اسے حرام سمجھتے''۔

حضرت عدیؓ نے کہا: ہاں! ایسا تو ہوتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہی ان کی عبادت ہے'' (44)۔

اس سے جو چیز کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس کی اطاعت کی جاتی ہے گویا اس کی عبادت کی جارہی ہے اور اسے رب بنایا جاتا ہے۔

مشرکین عرب خود کو دین ابراہیم علیہ السلام کے پیرو کہا کرتے تھے۔ کیا انہیں حق جل شانہ کی الوہیت اور ربوبیت سے انکار تھا؟ کیا انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے انکار تھا یا وہ اللہ کو دعائیں سننے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا نہیں سمجھتے تھے؟۔ کیا ان کا خیال تھا کہ لات ومنات، عزی اور ہبل نے

....

(43) التوبہ 31

(44) حقیقة الاسلام والایمان، از علامہ ابن تیمیہؒ

کائنات کو تخلیق کیا اور وہی مدبر اور منتظم ہیں۔اس کا جواب قرآن ہمیں دیتا ہے:

﴿ قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ، قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ، قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ ، بَلْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴾

''اے نبی ﷺ ان سے کہو، زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملک ہے؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی ملک ہے، کہو پھر تم نصیحت قبول کیوں نہیں کرتے، کہو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ، کہو پھر تم نہیں ڈرتے، کہو ہر چیز کے شاہانہ اختیارات کس کے ہاتھ میں ہیں، اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلے میں پناہ دینے کی طاقت کسی میں نہیں، بتاؤ اگر جانتے ہو، وہ کہیں گے یہ صفت اللہ ہی کی ہے، کہو پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے؟''(45)۔

اگر مکہ کے مشرکین اللہ تعالی کو مالک کائنات، عرش عظیم کا رب، تمام اختیارات کا مالک اور پناہ دینے والا مانتے تھے تو پھر اسلام سے ان کا جھگڑا کس بات پر تھا؟ کیا وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے لات، منات اور ہبل کی پرستش کی، قرآن مجید ہمیں اس کا جواب دیتا ہے:

﴿ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ﴾

''خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں

....

(45)المومنون 84،90

کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں'' (46)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا:

﴿ وَيَقُولُونَ هَـؤُلاء شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّهِ ﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور ہماری سفارشی ہیں'' (47)۔

درج بالا تفصیل سے گمراہ قوموں کے نظریات قرآن کریم سے واضح ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی بھی قوم خدا کی ہستی کی منکر نہ تھی البتہ انہوں نے رب کے پانچ مفہوموں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا:

1) رب کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبر گیری، حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے، ان کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ رب اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے مگر اس کے ساتھ فرشتوں، دیوتاؤں، جنوں، غیر مرئی قوتوں، ستاروں، سیاروں، انبیاء اور روحانی پیشوا کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

2) رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدار اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے، ان کے نزدیک ایک دوسری حیثیت رکھتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے انسانوں کو رب مانتے یا نظریہ کی حد تک اللہ کو رب ماننے کے بعد عملاً انسانوں کی اخلاقی، تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سر اطاعت خم کئے دیتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے ابتداء سے انبیاء آتے رہے۔ ان کی دعوت تھی کہ ربوبیت نا قابل تقسیم ہے۔ قرآن مجید ربوبیت کو حاکمیت اور سلطانی کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ رب یہ تصور پیش کرتا ہے کہ وہ کائنات کا سلطان مطلق اور لاشریک مالک و حاکم ہے۔

....

(46) الزمر 3

(47) یونس 18

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور تمام جہان کا پروردگار، مربی اور حاجت روا ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا کفیل، خبر گیر، مختار اور معتمد علیہ ہے۔

اسی حیثیت سے اس کی وفاداری وہ قدرتی بنیاد ہے جس پر ہماری اجتماعی زندگی کی عمارت صحیح طور پر قائم ہوسکتی ہے۔اس کی مرکزیت سے وابستگی تمام متفرق افراد اور گروہوں کے درمیان ایک امت کا رشتہ پیدا کردیتی ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہماری اور تمام مخلوقات کی بندگی، اطاعت اور پرستش کا مستحق ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور ہر چیز کا مالک، آقا اور فرمانروا ہے۔

رب کے بارے میں درج بالا تصور ہمارے ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔رب کیونکہ ہمارا مالک ہے اس لئے اسی کا حکم چلنا چاہئے، اسی کی فرمانبرداری اور اطاعت کی جائے اور اسی کا نظام اور قانون نافذ ہو۔

رسول اکرم ﷺ کو نبوت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد جو اولین حکم ملا وہ قابل غور ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِر، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبر دار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو'' (48)۔

رب کے متعلق قرآن مجید کا جو تصور درج بالا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ آیت کو دوبارہ پڑھیں، رب کی بڑائی کا اعلان بجز اس کے اور کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہو اور اسی کا قانون اور نظام نافذ کیا جائے۔

جب اس معنی میں آدمی اللہ تعالی کو اپنا رب کہے گا تو پھر دنیا اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گی۔اس کی راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے، اسے تکلیف اور مصیبتوں سے گزارا جائے گا اور اس کے اپنے بھی دشمن ہوجائیں گے۔اللہ تعالی کو اپنا رب کہنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، اس کی

....

(48) المدثر 1، 3

تفصیل قرآن مجید میں ہمیں جگہ جگہ ملتی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا ﴾

''جن لوگوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے، پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے''۔

ربنا اللہ کہنے کے بعد اپنے کہے پر جوڈٹ جاتے ہیں، جم جاتے ہیں، ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے:

﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ، نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ، نُزُلاً مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴾

''یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، نہ ڈرو نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں تم جو کچھ چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے'' (49)۔

ربنا اللہ کہنے کے بعد اس پر استقامت دکھانے والوں کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

اللہ تعالی ان جادوگروں کی مثال دیتا ہے جو حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے، مقابلہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے فرعون سے کہا:

﴿ وَجَاء السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُواْ إِنَّ لَنَا لَأَجْراً إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴾

''جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟''۔

فرعون نے جواب میں کہا:

﴿ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴾

....

(49) حم سجدہ 30، 32

''اس نے کہا: ہاں، اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے'' (50)۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ یہ جادوگر محض دنیاوی انعام کے لالچ میں آئے تھے اور فرعون نے بھی انہیں انعام واکرام کے علاوہ اپنے مقربین میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب مقابلہ شروع ہوا تو قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

﴿ وَجَاءُ وا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴾

''اور بڑا ہی زبردست جادو لائے'' (51)۔

حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلے میں وہ انتہائی عظیم جادو لائے تھے مگر حق کو دیکھنے کے بعد ان کا کیا حال ہوا:

﴿ وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴾

''اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرادیا'' (52)۔

اللہ نے ان کیلئے ایسا بندوبست کردیا کہ وہ جادوگر مجبور ہو گئے سجدہ کرنے کیلئے۔ انہوں نے سجدہ کیا اور فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اعلان کیا:

﴿ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ، رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ ﴾

''ہم نے رب العالمین کو مان لیا، اس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں'' (53)۔

وہ جادوگر جو دنیاوی لالچ کیلئے حضرت موسی علیہ السلام سے مقابلہ کرنے آئے تھے، بھرے دربار میں اللہ تعالی کو اپنا رب ماننے کا اقرار کرتے ہیں اور چونکہ فرعون بھی اپنے آپ کو رب کہتا تھا لھذا جادوگروں

....

(50) الاعراف 113، 114

(51) الاعراف 116

(52) الاعراف 120

(53) الاعراف 121، 122

نے وضاحت ضروری سمجھی کہ ہم اس رب العالمین کو مانتے ہیں جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔

مگر کیا فرعون اپنی اس توہین پر خاموش رہ سکتا تھا؟۔ یقیناً نہیں! ہار اور جیت کا فیصلہ تو اسی کو کرنا تھا، اس نے بلکتے ہوئے کہا:

﴿ إِنَّ هَـذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ﴾

''یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو'' (54)۔

تم نے بڑی چال چلی اور لگتا ایسا ہے کہ (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تمہارا استاد ہے:

﴿ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾

''معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی'' (55)۔

وہ فرعون جس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کروادیا اور جو کہا کرتا تھا:

﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ﴾

''میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں'' (56)۔

جادوگروں کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

﴿ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴾

''میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوادوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا'' (57)۔

جادوگروں کو یقین تھا کہ فرعون جب اس طرح کی دھمکی دیتا ہے تو وہ محض دھمکی ہی نہیں ہوتی، وہ

....

(54) الاعراف 123

(55) طٰہٰ 71

(56) النازعات 24

(57) الاعراف 124

یقیناً ایسا ہی کرے گا۔ اللہ تعالی کو محض زبان سے اپنا رب کہنا کمال نہیں بلکہ اس پر ڈٹ جانا ہی اصل مقصود ہے، اس موقع پر جو لوگ ڈٹ جاتے ہیں ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور وہ ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، ہم تمہارے ساتھی ہیں، چنانچہ جادوگروں نے ایسا ہی کیا:

﴿ قَالُوا لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴾

''جادوگروں نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں، تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے، تو زیادہ سے زیادہ اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے'' (58)۔

اللہ کو اپنا رب کہنے اور اس پر استقامت دکھانے والوں کیلئے قیامت تک کیلئے یہ مثال ہے۔ ایمان لانے سے پہلے جادوگروں نے فرعون کی عزت کا نعرہ لگایا تھا:

﴿ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴾

''فرعون کی عزت کی قسم، آج ہم ہی غالب رہیں گے'' (59)۔

مگر اللہ تعالی کو اپنا رب کہنے کے بعد فرعون سے کہنے لگے:

﴿ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ﴾

''ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کردے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے، اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے'' (60)۔

....

(58) طہ 72

(59) الشعراء 44

(60) طہ 73

ان جادوگروں کے ساتھ فرعون نے کیا معاملہ کیا؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا، تفاسیر میں ہے کہ فرعون نے ان جادوگروں کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں میں کٹوادیئے، انہیں دردناک عذاب دے کر انہیں سولی پر چڑھادیا۔ اللہ تعالی ان مومن جادوگروںؒ کو جنت الفردوس نصیب کرے مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں کیوں نہیں ہے؟۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ بعد کے واقعات کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کے ذکر کی اہمیت نہیں۔ گویا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اللہ کو اپنا رب ماننے والوں کے ساتھ طاغوت ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہا ہے۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کی ایک اور مثال اس مرد مومن کی ہے جس کا ذکر سورہ یاسین میں کیا گیا:

﴿ وَجَاء مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى ﴾

''اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا''۔

اس مرد نے آکر اپنی قوم سے کہا:

﴿ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ﴾

''اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کرو''۔

جب میں تم سے کہتا ہوں کہ ان کی پیروی کرو تو اس لئے کرو کہ:

﴿ اتَّبِعُوا مَن لاَّ يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴾

''پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں''۔

انہوں نے کھل کر اس بات کا اعلان کیا کہ:

﴿ إِنِّي آمَنتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ ﴾

''میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو''۔

شہر کے دور دراز گوشے سے دوڑتے ہوئے آنے والا اس مرد مومن کا نام حبیب النجارؒ بتایا جاتا ہے۔

قرآن مجید ہمیں یہ تفصیل نہیں بتاتا کہ جب حضرت حبیب النجارؒ نے پوری قوم کو یہ کہہ کر چیلنج کیا کہ میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟۔قرآن مجید جو منظر ہمیں دکھاتا ہے، وہ ان کی شہادت کے بعد کا ہے:

﴿ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ﴾

''اس سے کہا گیا: داخل ہو جاؤ جنت میں'' (61)۔

مگر تفاسیر میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت حبیب النجارؒ نے جب قوم سے کہا کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں تو انہیں آروں سے چیرا گیا۔ دوسری روایت ہے کہ انہیں کچلا گیا یہاں تک کہ ان کی آنتیں باہر آ گئیں ۔قرآن نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ گویا اللہ کو اپنا رب کہنے اور اس پر استقامت اختیار کرنے والوں کو دنیا کبھی برداشت نہیں کرتی،ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کی ایک اور مثال ان نوجوانوں کی ہے جنہوں نے اپنا دین اور ایمان بچانے کیلئے غار میں پناہ لی تھی اور اللہ تعالی نے انہیں 309 سال تک سلا دیا تھا،قرآن مجید ان کی تفصیل ہمیں بتاتا ہے:

﴿ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ﴾

''وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی''۔

جب انہوں نے صدق نیت دکھائی اور ان کے اخلاص میں کھوٹ نہیں تھا تو اللہ تعالی نے بھی ان کے ایمان کو مضبوط کر دیا:

﴿ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ ﴾

''ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے''۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کے بعد وہ کسی گوشہ میں چھپ کر نہیں بیٹھے بلکہ:

....

(61) یاسین 13 تا 28

﴿ إِذْ قَامُوا ﴾

''جب وہ اٹھے اور کھڑے ہو گئے''۔

وہ ڈٹ گئے اور پوری قوم سے ٹکر لیتے ہوئے کہا:

﴿ فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَٰهاً ﴾

''ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نوجوان بندوں کی حفاظت یوں فرمائی کہ ایک غار میں انہیں 309 سال تک سلا دیا اور ان کا ذکر قیامت تک کیلئے زندہ کر دیا(62)۔

اس طرح ربنا اللہ کہنے والوں کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں، اسی لئے ہم سے مطالبہ ہے کہ:

﴿ كُونُواْ رَبَّانِيِّينَ ﴾

''تم ربانی بن جاؤ''(63)۔

اللہ تعالیٰ کے مبارک نام رب کی مذکورہ تفصیل اور معانی سامنے رکھئے، پھر سوچئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہر شخص سے قبر میں پہلا سوال جو ہوگا وہ یہ ہوگا:

''مَنْ رَبُّكَ''

''تمہارا رب کون ہے؟''۔

یعنی بتاؤ تم نے دنیا میں کس کس کو رب بنا رکھا تھا؟۔

اللہ تعالیٰ کے مبارک نام ''الرب'' کے حوالے سے پوری تفصیل گزر چکی ہے۔ اس سے ہمیں معلوم

....

(62) درج بالا آیات اور مذکورہ واقعہ سورہ الکہف 10 تا 22 میں مذکور ہے۔

(63) آل عمران 79

ہوا کہ ربوبیت نا قابل تقسیم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے یعنی پالنے والا، پرورش کرنے، خبر گیری کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا تو اسی کا اقتدار اور اسی کا حکم چلنا چاہیئے۔ اسی کا قانون نافذ ہو۔ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اپنا رب مانیں اور تسلیم کریں۔ ہمارے دلوں میں جتنے بھی ارباب ہیں ان سب کو نکال باہر کریں اور اسی رب کی بالادستی تسلیم کریں جو حقیقی معنوں میں ہمارا رب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں ویڈیو وی ڈی، سی ڈی اور آڈیو کیسٹ میں بھی دستیاب ہے۔

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الرحمن الرحیم

سورہ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾

”اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے، تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمٰن اور حیم ہے، روز جزا کا مالک ہے“۔

”اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد رحیم کے اضافے میں مبالغے کا نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے اور ایسی بے حد وحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑے مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے کہ اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کیلئے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ”سخی“ کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ”داتا“ کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ”گورے“ کو کافی نہیں سمجھتے تو اس پر ”چٹے“ کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں“ (1)۔

”الرحمٰن خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو محض اس نام سے پکارے

....

(1) تفہیم القرآن، از سید الابوالاعلیٰ مودودیؒ، 1/44

یا پکارا جانا پسند کرے۔علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالی دنیا میں عموماً رحمت کے اعتبار سے رحمٰن ہے اور یہ رحمت مومن اور کافر دونوں کیلئے عام ہے لیکن آخرت میں خاص طور پر اپنے فرمانبردار بندوں پر رحمت کے اعتبار سے رحیم ہے۔رحمت کے لفظ کے معنی تو معلوم ہیں لیکن کیفیت کے ادراک سے مخلوق عاجز ہے"(2)۔

عربی میں "فعلان" کا باب عموماً ایسے صفات کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں،مثال کے طور پر:

پیاسے کیلئے: عطشان

غضبناک کیلئے: غضبان

سراسیمہ کیلئے: حیران

مست کیلئے : سکران

لیکن "فعیل" کے وزن میں صفات قائمہ کا خاصہ ہے۔یعنی عموماً ایسی صفات کیلئے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں،مثلاً:

کریم: کرم کرنے والا

عظیم: بڑائی کرنے والا

علیم: علم رکھنے والا

حکیم: حکمت رکھنے والا

پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن اور ہر لمحہ تمام کائناتِ خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

....

(2)الاسماء الحسنی ،از محمد ایوب سپرا،ص 47

''رحمت کو دو الگ الگ ناموں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس لئے کہ قرآن خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ تمام تر رحمت ہی ہے''(3)۔

الرحمٰن الرحیم، دو عظیم الشان اسم ہیں جن سے اللہ تعالی نے ام القرآن یعنی سورہ الفاتحہ کا آغاز کیا نیز قرآن مجید کی ہر سورہ کا افتتاح بھی اسی سے کیا۔ یہ وہ دونام ہیں جن سے انسان شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے، یہی وہ نام ہیں جن سے حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کے نام اپنے خط کا افتتاح کیا:

﴿ إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴾

''(ملکہ بولی:) اے اہل دربار! میری طرف ایک اہم خط پھینکا گیا ہے، وہ سلیمان کی جانب سے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے''(4)۔

اور انہی دوناموں کو لے کر حضرت جبریل علیہ السلام ہرنئی سورہ کا افتتاح کرتے تھے''(5)۔

علامہ خطابیؒ کا کہنا ہے:

''الرحمٰن وہ ہے جس کی رحمت تمام مخلوق پر چھا گئی ہے۔ ان کا رزق، ان کا معاش اور ان کے تمام اسباب اسی میں داخل ہیں۔ اس کے رحمت کے تحت کافر اور مومن، صالح اور فاجر سب شامل ہیں جبکہ الرحیم صرف مومنوں کے لئے خاص ہے''(6)۔

الرحمٰن اللہ تعالی کی ذاتی صفت ہے جبکہ الرحیم کا تعلق مرحوم سے ہے، یعنی وہ جس پر رحم کیا گیا۔ اس

....

(3) ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد 1/64

(4) النمل 30

(5) فقه الاسماء الحسنى ، عبد الرزاق بن عبد المحسن البدر ، ص 99

(6) الجامع لاسماء الله الحسنى، حامد احمد اطاهر، ص 140

طرح پہلا نام وصف ہے جبکہ دوسرا فعل ۔ پہلے نام سے مراد یہ ہے کہ رحمت اس کی صفت ہے جبکہ دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر رحم کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيماً ﴾

''وہ مومنوں پر بہت رحیم ہے'' (7)۔

﴿ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾

''بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا ہے'' (8)۔

قرآن مجید میں کہیں بھی" رحمن بهم " یعنی وہ ان پر رحمٰن ہے،نہیں آیا۔معلوم ہوا کہ رحمٰن وہ ہے جس کی صفت رحمت ہے اور رحیم وہ ہے جو اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے'' (9)۔

قرآن مجید میں الرحمٰن کا ذکر 57 مرتبہ ہوا جبکہ الرحیم 123 مرتبہ آیا ہے۔اکثر مواقع میں الرحیم ''التواب،الغفور،الروؤف،الودوداور العزیز'' کے ساتھ وارد ہوا ہے (10)۔

اللہ تعالی اپنے عرش پر رحمٰن کے نام سے جلوہ افروز ہوا:

﴿ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ﴾

''وہ رحمٰن،تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے'' (11)۔

﴿ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمَنُ ﴾

''پھر آپ ہی عرش پر جلوہ فرما ہوا،رحمٰن'' (12)۔

....

(7) الاحزاب 43

(8) التوبہ 117

(9) بدائع الفوائد،ازعلامہ ابن قیمؒ،ص 20،21

(10) دیکھئے قرآن سرچ انجن: المصحف الرقمی

(11) طٰہ 5　　(12) الفرقان 59

کیونکہ عرش الٰہی ساری کائنات پر محیط اور اس کو گھیرے ہوئے ہے اور رحمٰن کی رحمت تمام مخلوقات پر سایہ فگن ہے:

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾

''میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے'' (13)۔

اس ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک دعا نقل کی جاتی ہے، آپؒ دعا کیا کرتے تھے:

''اے اللہ تو نے کہا ہے اور تیرا کہا سچ ہے، میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، میں بھی ایک چیز ہوں، مجھ پر بھی تیری رحمت چھا جائے''۔

اللہ کی رحمت کے دو حصے ہیں:

ایک عام رحمت جو تمام مخلوقات کیلئے یکساں ہے۔ اسی رحمت میں ان کی تخلیق، تدبیر، رزق، نعمتیں اور احسانات وغیرہ داخل ہیں۔

علامہ ابن عثیمینؒ کا کہنا ہے:

''کافر کے لئے اس کی رحمت بدنی اور دنیوی ہے، دنیا میں کافر کو رزق اور نعمتیں اللہ ہی عطا کرتا ہے اور ان نعمتوں کا تعلق صرف دنیا تک ہے'' (14)۔

رحمت کا دوسرا حصہ صرف مومنین کے لئے ہے، وہی ان کے دنیاوی معاملات کی تدبیر کرتا ہے، وہی ان کو ہدایت عطا کرتا ہے، وہی انہیں صراط مستقیم پر چلاتا ہے، وہی ان کے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان کے درجات کو بلند کرتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ

....

(13) الاعراف 156

(14) شرح العقیده الواسطیه 1/249

﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْماً ﴾

''وہی ہے جوتم پر رحمت فرماتا ہےاوراس کے ملائکہ تمہارے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے''(15)۔

علامہ ابن قیمؒ کا کہنا ہے:

اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، اس کی نعمت ہر مخلوق تک پہنچی ہوئی ہے، اس رحمت کی وہاں تک پہنچ ہے جہاں تک اس کا علم پہنچا ہوا ہے۔

علامہ ابن القیمؒ مزید فرماتے ہیں:

اللہ کی رحمانیت سورہ الرحمٰن میں کھل کر سامنے آتی ہے، ارشاد ہوا:

﴿ الرَّحْمَنُ ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴾

''الرحمٰن، اس نے قرآن کو تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اسے بولنا سکھایا''(16)۔

سورہ الرحمٰن کی ابتدا رحمٰن کی رحمانیت کے چار اہم مظاہر سے ہوئی:

* اللہ تعالی کے تمام مبارک ناموں میں سے عظیم المرتبت نام الرحمٰن کا ذکر ہوا۔
* اللہ تعالی کی تمام کتابوں میں قرآن مجید کو الرحمٰن نے تعلیم دی۔
* تمام مخلوقات میں سب سے افضل، انسان کی تخلیق کا ذکر ہوا۔
* انسان میں سب سے نمایاں اور افضل ترین صفت، بیان کا ذکر ہوا۔

سورہ الرحمٰن کا اختتام اس بات پر ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴾

....

(15) الاحزاب 43

(16) الرحمٰن 1،4

''بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام'' (17)۔

برکت والا نام وہ ہے جس سے اس سورہ کی ابتداء ہوئی، یعنی الرحمٰن، اسی بابرکت نام سے ہی برکت کا حصول ہوتا ہے اور اسی نام کے نہ لینے سے برکت مٹ جاتی ہے'' (18)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو سراہا ہے جنہوں نے رحمت کی صفت اپنائی ہے:

﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾

''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کیلئے شفیق اور رحیم ہے'' (19)۔

صحابہ کرامؓ کو سراہتے ہوئے فرمایا:

﴿ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ﴾

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں'' (20)۔

رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''میری امت پر، میری امت میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والے ابوبکر ہیں'' (21)۔

جنت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت قرار دیا ہے:

اَنْتِ رَحْمَتِیْ ، اَرْحَمُ بِکِ مَنْ أَشَاءُ

....

(17) الرحمٰن 78

(18) الصواعق المرسلہ، از علامہ ابن قیمؒ، 2/122

(19) التوبہ 128

(20) الفتح 29

(21) حدیث صحیح: براویت حضرت انس بن مالکؓ، دیکھئے: مسند احمد 3/281، ترمذی 2981

’’تو میری رحمت ہے، تیرے ذریعہ میں جس پر چاہوں رحم کروں‘‘ (22)۔

اس نے اپنے تمام بندوں کے لئے اعلان کروایا ہے کہ:

﴿ نَبِّءْ عِبَادِیْ أَنِّیْ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِیْمُ ، وَ أَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِیْمَ ﴾

’’اے نبی ﷺ، میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک ہے‘‘ (23)۔

اللہ تعالی کی رحمت وہ صفت ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّ اللّٰهَ کَتَبَ کِتَابًا قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ الْخَلْق: اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِی

’’اللہ تعالی نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب لکھ دی تھی کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے جائے گی‘‘ (24)۔

اسی مفہوم کی آیت بھی قرآن مجید میں ہے:

﴿ کَتَبَ عَلَی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾

اس نے رحم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے‘‘ (25)۔

دنیا میں بڑے فاسق، فاجر، ظالم اور ہزاروں افراد کو قتل کرنے والے لوگ گزرے ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالی ان کے اعمال کے پاداش میں انہیں دنیا میں ہی پکڑ کیوں نہیں لیتا۔ اس کا

....

(22) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، طویل حدیث کا ٹکڑا جسے بخاری 4850، مسلم 2846 نے نقل کیا ہے۔

(23) الحجر 49، 50

(24) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، السلسلة الصحیحة 1629، بخاری 7554، مسلم 2751

(25) الانعام 12

جواب ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے:

﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَاماً وَأَجَلٌ مُسَمًّى ﴾

''اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک کلمہ طے نہ کر دیا گیا ہوتا اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا'' (26)۔

مگر وہ کونسا کلمہ ہے جو پہلے سے طے ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے ظالموں کو مہلت دی گئی؟ علمائے کرام کا کہنا ہے کہ وہ کلمہ ہے:

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گی''

علامہ خطابیؒ کا کہنا ہے:

''الرحمٰن وہ ہے جس کی رحمت تمام مخلوق پر چھا گئی ہے۔ ان کا رزق، ان کا معاش اور ان کے تمام اسباب اسی میں داخل ہیں۔ اس کے رحمت کے تحت کافر اور مومن، صالح اور فاجر سب شامل ہیں جبکہ الرحیم صرف مومنوں کے لئے خاص ہے'' (27)۔

''سارے جہان میں کوئی دوسرا اس ہمہ گیر اور غیر محدود رحمت کا حامل نہیں، دوسری جس ہستی میں بھی صفت رحم پائی جاتی ہے اس کی رحمت جزوی اور محدود ہے اور وہ بھی اس کی ذاتی نہیں بلکہ خالق نے کسی مصلحت اور ضرورت کی خاطر اسے عطا کی ہے، جس مخلوق کے اندر بھی اس نے کسی دوسری مخلوق کے لئے جذبۂ رحم اس لئے پیدا کیا ہے کہ ایک مخلوق کو وہ دوسری مخلوق کی پرورش اور خوشحالی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، یہ بجائے خود اس کی رحمت بے پایاں کی دلیل ہے'' (28)۔

....

(26) طٰہٰ 129

(27) الجامع لاسماء الله الحسنى، حامد احمد اطاهر، ص 140

(28) تفہیم القرآن، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، 5/412

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حق سبحانہ وتعالیٰ نے جو پہلی بات فرمائی وہ قابل غور ہے:

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا اور روح اس کے سر میں گئی تو اسے چھینک آئی، فرشتوں نے کہا:

اے آدم کہو ''**الحمدلله**''۔

آدم نے کہا: ''**الحمدلله**''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَرْحَمُکَ رَبُّکَ يَا آدَم

''اے آدم! تیرا رب تجھ پر رحم کرے گا'' (29)۔

اندازہ کریں کہ تخلیق کے بعد رب سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے جو پہلی بات کی اس میں اپنی رحمت کو ان کے ساتھ شامل کیا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی بہتری کے اسباب پیدا کرتا ہے، خواہ وہ انہیں پسند نہ آئیں یا ان پر شاق گزریں۔ اس کی مثال بیٹے کے ساتھ باپ کی شفقت ہے کہ وہ اس کی تعلیم وتربیت اور تادیب کے لئے اس سے وہ وہ کام کرواتا ہے جو بیٹے پر شاق گزرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کا معاملہ کرتے ہوئے انہیں آزمائشوں میں ڈالتا ہے، انہیں امتحانوں سے گزارتا ہے، انہیں مشکلات سے دوچار کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بندوں کی بہتری کس میں ہے۔

اثر میں آیا ہے کہ آزمائش اور مصیبت میں مبتلا شخص کیلئے جب کوئی دعا کرتا ہے کہ:

یا اللہ اس پر رحم فرما۔

....

(29) تفسیر ابن کثیر، 1/109

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اس پر رحم ہی کر رہا ہوں کہ اس کی بہتری کیلئے اسے میں نے آزمائش میں ڈالا ہے۔

سورہ یاسین کے مرد مومن نے کہا:

﴿ إِن يُرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئاً وَلَا يُنقِذُوْنِ ﴾

''حالانکہ رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں'' (30)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس مرد مومن نے نقصان کیلئے تمام ناموں کو چھوڑ کر رحمٰن کا نام کیوں منتخب کیا؟۔ کیا رحمٰن جس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، وہ اپنے مومن بندوں کیلئے نقصان چاہتا ہے؟ یقیناً نہیں، تو پھر مردِ مومن نے نقصان کیلئے رحمٰن نام کا انتخاب کیوں کیا؟۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن بندے کو رحمٰن کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی خیر ملتا ہے، کبھی بظاہر کوئی نقصان بھی پہنچا تو اس میں بندے کیلئے خیر ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بندہ کی نظر اس خیر کی طرف نہیں جاسکتی۔

قرآن مجید کا ایک اور مقام قابل غور ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَآ أَبَتِ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيّاً ﴾

''ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں'' (31)۔

عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑنے کے بجائے کوئی اور مناسب نام جوڑنا چاہئے تھا۔ حضرت

....

(30) یاسین 23

(31) مریم 45

ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ:

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ جبار، قہار یا منتقم کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں“

مگر آپؑ نے خاص طور پر عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑ دیا۔ رحمٰن تو سراسر رحمت ہے مگر عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑنے میں لطیف نکتہ ہے، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں کہ ابا جان، اللہ تعالیٰ بہت رحم فرمانے والا ہے، اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، وہ رحمٰن اگر کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو سزا دی جا رہی ہے اس میں رحمت کے قابل کوئی ذرہ باقی نہیں، اگر رحمت کے قابل کوئی ذرہ ہوتا تو رحمٰن اس پر ضرور رحم کرتا“(32)۔

الرحمٰن الرحیم وہ ہے جو ”برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیئے چلا جاتا ہے اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لئے تیار رہتا ہے“(33)۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے! الرحمٰن وہ ہے جو برسوں کی نافرمانیاں لمحہ بھر میں معاف کر دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل سخت قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہو گئے اور عرض کیا:

اے کلیم اللہ! اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ بارش برسا کر ہمیں پانی سے نوازے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کیا اور صحراء کی طرف نکل گئے۔ وہ سب اللہ کے حضور اکٹھے ہو گئے اور دعائیں مانگنے لگے مگر آسمان سے پانی کی بوند تک نہ گری بلکہ الٹا سورج کی تمازت و حرارت میں تیزی و شدت آ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پھر بارش کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

....

(32) شرح الاسماء الحسنی، شیخ عبد العزیز بن ناصر الجلیل

(33) تفہیم القرآن، 3/480

''تمہیں بارش سے کیوں نوازوں جبکہ تمہارے درمیان ایک شخص ایسا ہے جو 40 برس سے گناہوں میں مبتلا ہوکر باغی ہوگیا ہے۔اس کی نحوست کی وجہ سے میں نے بارش روک لی ہے۔اس سے کہو کہ وہ تمہارے درمیان میں سے نکل جائے۔وہ جب تک تمہارے درمیان ہوگا بارش نہیں ہوگی''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! تمہارے درمیان ایک شخص ہے جو 40 سال سے اللہ کی نافرمانی کررہا ہے،اس کی نحوست کی وجہ سے اللہ نے بارش روک لی ہے۔ میں اسے حکم دیتا ہے کہ وہ ہمارے درمیان میں سے نکل جائے۔وہ جب تک نہیں نکلے گا بارش نہیں ہوگی''۔

لوگوں نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کردیا۔وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کون ہے یہ بدبخت،نافرمان اور منحوس جس کی وجہ سے اللہ نے بارش روک لی ہے۔

اس نافرمان بندے نے بھی لوگوں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھا مگر کسی کو اس اجتماع سے باہر جاتے نہ پایا تو اسے یقین ہوگیا کہ خود وہی مطلوب ہے۔اس نے اپنے دل میں کہا:

اگر میں ان تمام لوگوں میں سے اٹھ کر باہر نکل جاؤں تو پورے بنی اسرائیل کی نظر میں میں ذلیل ورسوا ہو جاؤں گا اور اگر میں شرم کے مارے بیٹھا رہا تو میری وجہ سے یہ سب لوگ پیاس سے مرجائیں گے۔وہ یہ سوچ کر بہت ہی دل شکستہ ہوا۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔اس نے اپنے افعال پر ندامت کی وجہ سے اپنا منہ اپنے کپڑوں میں چھپالیا اور اللہ کے حضور یوں عرض گزار ہوا :

یا الٰہی ! اے میرے آقا و مولیٰ ! میں نے 40 سال تک تیری نافرمانی کی۔اس کے باوجود تو نے میری پردہ پوشی کی اور مجھے مہلت دیئے رکھی۔اب میں سرِ تسلیم خم کئے تیرا مطیع وفرمانبردار بن کر تیرے دربار میں حاضر ہوگیا ہوں،میری اس حاضری کو قبول فرما۔میری توبہ قبول کر۔

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کرپایا تھا کہ بادلوں کا ایک ٹکڑا اٹھا،آسمان کے وسط میں بلند ہوا اور

اس نے یوں زوردار بارش برسانا شروع کردی جیسے کہ مشکیزوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر تعجب میں مبتلا ہوگئے اور اپنے رب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے:

''اے اللہ! تو نے ہمیں بارش عطا فرمادی جبکہ ہمارے درمیان میں سے کوئی بھی آدمی اٹھ کر باہر نہیں گیا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے موسیٰ! میں نے جس کی وجہ سے بارش روکی تھی، اب اسی کی وجہ سے برسا رہا ہوں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

''یا الٰہی! وہ مطیع وفرمانبردار بندہ مجھے بھی دکھلا دے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے موسیٰ! میرا وہ بندہ جب باغی تھا، اس وقت بھی میں نے اسے رسوا نہیں کیا، اب جبکہ وہ تائب ہوگیا ہے تو اسے کیسے رسوا کروں''۔

مذکورہ واقعہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے مگر اس میں اللہ کی رحمانیت اور رحیمیت کی ایک جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

اللہ کی رحمانیت کے حوالے سے ایک اور واقعہ ملاحظہ کریں:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہوکر آئے، ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیرخوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ مامتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حال دیکھ کر لوگوں سے پوچھا:

''کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ میں پھینک دے گی؟''۔

لوگوں نے عرض کیا:

ہرگز نہیں! خود پھینکنا تو درکنار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک اسے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کیلئے رکھتی ہے'' (34)۔

اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی دیکھئے کہ وہ فرعون جیسے باغی اور سرکش کے ساتھ بھی رحم کا معاملہ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس بھیجتا ہے، فرماتا ہے:

﴿ اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ﴾

''اب فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے'' (35)۔

فرعون سرکش اور باغی ہو گیا ہے، اس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دیا، وہ زمین پر رب بنا پھرتا ہے مگر اس پر بھی اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے، حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام سے فرماتا ہے:

﴿ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴾

''اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے'' (36)۔

یعنی اتنے بڑے گناہوں کے باوجود اس کیلئے واپسی کا راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ہے اللہ کی شان رحیمی۔

اسرائیلیات میں ہے کہ جب فرعون ڈوب رہا تھا اور مرنے کے قریب تھا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکار پکار کر بچانے کی درخواست کی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکی ایک نہ سنی۔ روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوتے فرمایا:

اے موسیٰ! تو کتنا سنگ دل ہے۔

....

(34) حدیث صحیح: بروایت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، بخاری 5999، مسلم 2754

(35) النازعات 17

(36) طہٰ 44

اس نے تمہیں سو دفعہ پکارا مگر تم نے اسے جواب نہیں دیا۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جاہ وجلال کی، اگر وہ مجھے ایک مرتبہ بلاتا تو میں اسے بچالیتا۔

یہ ہے اللہ کی رحمت فرعون جیسے شخص کے ساتھ جو کہا کرتا تھا:

﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ﴾

''میں تمہارا رب ہوں، سب سے بڑا''

کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اس شخص کے ساتھ کیا حال ہوگا جو دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے حضور سجدہ کرکے کہتا ہے:

سبحان ربی الاعلیٰ

اس رحمت کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے پہلے خود پر رحم کرتے ہوئے اسے جہنم کی آگ سے بچائے، پھر جن کا وہ کفیل ہے، پھر اپنے رشتہ داروں، دوست احباب اور تمام انسانیت پر رحم کرے۔

رسول اکرم ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے۔ ہم جنت میں بھی اللہ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہوسکتے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم سے کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرسکتا''

پوچھنے والوں نے پوچھا:

آپ ﷺ کا عمل بھی نہیں۔

فرمایا:

'' میرا عمل بھی مجھے جنت میں داخل نہیں کراسکتا سوائے اس کے کہ اللہ کی رحمت مجھے گھیر لے''(37)۔

....

(37)حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوہریرہؓ، بخاری 5673، مسلم 2816

گزشتہ صفحات میں اللہ تعالیٰ کے دو مبارک نام ''الرحمٰن الرحیم'' چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو مبارک ناموں میں اتنی وسعت ہے کہ ان پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ایک عرب محقق شیخ ابو عبدالرحمٰن سلطان علی نے ''**الریاض النعیم فی ظل الرحمن الرحیم**'' نامی دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔پہلی کتاب 465 صفحات جبکہ دوسری 632 صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں کتابوں میں انہوں نے ''الرحمٰن الرحیم'' کی تشریح کی ہے۔ یہ قابل قدر کوشش ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے ان دو ناموں کا حق ادا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا۔معلوم ہوا کہ اس پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔گزشتہ صفحات میں اللہ تعالیٰ کے مبارک نام الرحمٰن الرحیم کے جن چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ایک اور مبارک نام پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل ویڈیو ڈی وی ڈی، سی ڈی اور آڈیو کیسٹ میں بھی دستیاب ہے۔

اسماء حسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری آسان تشریح

عبدالستار خان

الحق

قارئین کرام!

اسماء اللہ الحسنٰی کے اس مبارک سلسلے میں ہم نے تمہید کے بعد اب تک ''اللہ، الالٰہ، الرب، الرحمن اور الرحیم'' کا ذکر کیا ہے اور اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ علمی مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے ان ناموں کی تشریح آسان ترین انداز میں کریں۔ ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے رب کو جانیں، پہچانیں اور اس سے محبت کریں۔ جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ ان مبارک ناموں کے حوالے سے ہمارا تصور جتنا واضح ہوگا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق گہرا ہوگا۔ اب اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور مبارک نام ''الحق'' پر روشنی ڈالتے ہیں۔

''الحق'' اور ''حق'' قرآن مجید میں جا بجا آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس نام کا استعمال جن مقامات پر آیا ہے ان میں سے چند کا ذکر ہے:

﴿ ذٰلِکَ بِأَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ ﴾

''یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے''(1)۔

﴿ وَرُدُّوا إِلَی اللّٰہِ مَوْلاَھُمُ الْحَقِّ ﴾

''سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیئے جائیں گے''(2)۔

....

(1) الحج 6

(2) یونس 30

﴿ فَذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ﴾

''تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے''(3)۔

﴿ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴾

''پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا''(4)۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی آیات ہیں جن میں یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ''الحق'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔''الحق'' کے ضمن میں ہم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ حق کا مطلب کیا ہے؟۔

حق باطل کی ضد ہے۔حق وہ چیز ہے جس کے وجود کا یقین کامل ہو۔اس میں ذرا برابر شک نہ ہو، اگر یہ بات ہے تو''الحق''اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وجود سب سے بڑی اور ظاہر حقیقت ہے بلکہ احق الحائق یہ ہے کہ اللہ حق ہے۔اس کا امر حق ہے، اس کا نہی حق ہے، اس کا ہر ہر فعل حق ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ قُلِ اللّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ ، قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لاَّ يَهِدِّيَ إِلاَّ أَن يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴾

''ان سے پوچھو، تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی، پھر تم یہ کس

....

(3) یونس 32

(4) المومنون 116

الٹی راہ پر چلے جا رہے ہو؟ ،ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ ، کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بھلا بتاؤ ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ ،آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو؟''(5)۔

اگر وہ حق ہے، اس کا کہا حق ہے، اس کا ہر فعل حق ہے اور وہی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو پھر حق کی تلاش اس کے سوا کسی اور کے پاس کیسے کی جا سکتی ہے؟ ۔کائنات کا نظام حق پر قائم ہے اور جو اس کے خلاف چلے گا وہ کائنات کے خلاف چل رہا ہوگا۔

''اللہ تعالیٰ کا وجود محض ایک خیالی اور فرضی وجود نہیں جسے بعض عقلی مشکلات رفع کرنے کی خاطر مان لیا گیا ہو۔ وہ نرا فلسفیوں کے خیال کا آفریدہ ، واجب الوجود اور علت العلل نہیں بلکہ حقیقی فاعل مختار ہے جو ہر آن اپنی قدرت ، اپنے ارادے ، اپنے علم اور اپنی حکمت سے پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ حق ہے اور اس کا ہر کام سنجیدہ ، بامقصد اور پر حکمت ہوتا ہے''(6)۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں حق ہے۔ وہ حق ہے اور حق کو بلند کرنے والا ہے۔ ایمان والوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے، اس کے مقابلے میں ہر طاغوت باطل ہے۔

یہاں ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق اور عدل میں فرق کیا ہے؟

عدل کی تعریف یہ ہے کہ:

ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دیا جائے۔

....

(5) یونس 35

(6) تفہیم القرآن ، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

معلوم ہوا کہ عدل حق کا عملی نفاذ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا نام عادل نہیں بلکہ ''الحق'' رکھا ہے کیونکہ حق عدل سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ''الحق'' نہ ہوتا تو کائنات کا یہ نظام کس طرح چل سکتا تھا۔ کائنات کا نظام حق پر ہی قائم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ﴾

''اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا'' (7)۔

اللہ تعالیٰ ''الحق'' ہے، وہ کسی بستی کو کسی بستی پر فوقیت نہیں دیتا، کسی نسل کو کسی نسل سے برتر نہیں سمجھتا، کوئی رنگ اس کے نزدیک دوسرے رنگ سے بہتر نہیں۔

حضرت سے عمرؓ سے منسوب معروف دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ

''اے اللہ! ہمیں حق، حق بنا کر دکھا اور اس پر چلنا نصیب کر اور باطل، باطل بنا کر دکھا اور اس سے بچنے کی ہمیں توفیق عطا کر'' (8)۔

اس دعا میں کئی لطیف اشارے ہیں۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ حق آپ سے پوشیدہ رکھے۔ وہ حق پر باطل اور باطل پر حق کا لبادہ چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ کوئی آدمی حق کو جانتا ہو اور اس کی اتباع بھی کرے نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے معلوم ہو کہ یہ باطل ہے اور وہ اس سے بچنے کی بھی

....

(7) المومنون 71

(8) منتهى الارادات، از بہوتیؒ 3/497، نیز علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے سورہ البقرہ، آیت 213 کی تفسیر میں بھی اسے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دعا مسنون ہے، دیکھئے: تفسیر ابن کثیر 1/444۔

کوشش کرتا ہو،اسی لئے حضرت عمرؓ نے نہ صرف حق کو حق دکھانے کی دعا فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ ہمارے لئے اس کی اتباع آسان فرمادے نیز باطل کو نہ صرف باطل بنا کر دکھا بلکہ اس سے بچنا آسان کردے۔

اس دعا میں ایک اور لطیف اشارہ ہے کہ حق کو حق سمجھنا اور پھر اس کی اتباع کرنا اور باطل کو باطل سمجھنا اور اس سے بچنا اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے،اس لئے دعا کے الفاظ میں ''ارزقنا'' آیا ہے۔

حق کے ساتھ انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی اسے چھپاتا ہے،کوئی اس پر باطل کا لبادہ اوڑھ کر پیش کرتا ہے،کوئی حق سے ڈرا ہوا ہے،کوئی باطل کو حق سمجھ بیٹھا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں کہ حق کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلاَ تَلْبِسُواْ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُواْ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾

''باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو''(9)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی 8 حقیقتوں کو واضح فرمایا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک دعا سکھائی ہے جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز رات کے آخر پہر میں کیا کرتے تھے۔اگر یہ 8 حقیقتیں ہماری زندگی میں واضح اور حق بن جائیں تو وہ حق واضح ہو جائے گا جس پر زمین اور آسمان کو اللہ تعالیٰ نے استوار کیا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تھی:

''اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْحَقُّ ، وَقَوْلُکَ الْحَقُّ، وَوَعْدُکَ الْحَقُّ، وَلِقَائُکَ الحَقُّ، وَالْجَنَّةُ حَقٌ، وَالنَّارُ حَقٌ، وَالنَبِيُّونَ حَقٌ ، وَمُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم) حَقٌ''

''اے اللہ تو حق ہے، تیرا کہا حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تجھ سے ملاقات حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، انبیاء حق ہیں اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں''(10)۔

....

(9) البقرہ 42

(10) حدیث صحیح: براویت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، بخاری 1120 واضح رہے کہ یہ دعا اکثر کتب حدیث میں مختلف ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

ان 8 حقیقتوں کو دل، دماغ، وجدان اور وجود سے تسلیم کیا جائے۔ان 8 حقیقتوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ان 8 حقیقتوں پر ایمان کا کونسا معیار مطلوب ہے۔سیدنا حارثہؓ، رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

''اے حارثہؓ! تمہاری صبح کس حال میں ہوئی؟''۔

حضرت حارثہؓ نے عرض کیا:

''میری صبح اس حال میں ہوئی کہ میں حق اور حقیقی طور پر مومن ہوں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر دعوے کی ایک دلیل ہونی چاہیئے، تمہارے ایمان کی کیا دلیل ہے؟''۔

حضرت حارثہؓ نے عرض کیا:

''میری صبح اس حال میں ہوئی ہے گویا میں اپنے رب کے عرش کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھے اہل جنت، جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوتے دکھائی دے رہے ہیں اور گویا اہل جہنم، جہنم کے عذابوں سے دوچار ہوتے نظر آرہے ہیں، اس حال میں میں نے اپنے دن کو بھوک اور پیاس (روزے کی) حالت میں گزارا اور رات کو رتجگے (تہجد) کی حالت میں گزارا''۔

اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اے حارثہؓ! تم نے ایمان کی حقیقت کو پالیا ہے، اب اس پر ثابت قدم رہو'' (11)۔

حق کی 8 حقیقتوں پر ایمان کا یہ معیار ہونا چاہیئے کہ گویا ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

....

(11) علامہ ابن رجب حنبلیؒ نے اپنی کتاب ''جامع العلوم والحکم'' میں اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ عقیلیؒ نے ''الضعفاء الکبیر'' میں اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی اصل نہیں جبکہ علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں اس کے ایک راوی یوسف بن عطیہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے مختصر بزار میں لکھا ہے کہ اس حدیث کے شواہد ہیں۔

* اللہ تعالی حق ہے:

حق کی پہلی حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کہے کہ اللہ حق ہے، اگر اللہ حق ہے تو اس کا کہا بھی حق ہے، جب اس کا کہا حق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے ملاقات بھی حق ہوگی، جب اس سے ملاقات بھی حق ہے تو لامحالہ جنت بھی حق ہوگی، جب جنت حق ہے تو جہنم بھی حق ہوگی۔ جب یہ تمام چیزیں حق ہیں تو یہ حقیقتیں ہم تک پہنچانے والے انبیائے کرام علیہم السلام بھی حق ہیں اور جب انبیائے کرامؑ حق ہیں تو نبی اکرم ﷺ بھی حق ہیں۔ جب یہ تمام چیزیں حق ہیں تو حق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ یہ حقیقتیں اگر ذہن میں واضح ہوجائیں تو زندگی کتنی آسان ہوجائے گی۔

ارشادربانی ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾

’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقتِ مقررہ تک چلے جارہے ہیں‘‘ (12)۔

جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا وہ حق ہی ہوسکتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾

’’اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے‘‘ (13)۔

کائنات میں جہاں چاہے نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر چیز گواہی دے رہی کہ اسے برحق

....

(12) لقمان 29

(13) التغابن 3

پیدا کیا گیا ہے:

﴿ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ﴾

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''(14)۔

* اللہ تعالی کا کہا حق ہے:

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کہا حق ہے:

﴿ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ ﴾

''اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے''(15)۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ قَوْلُهُ الْحَقُّ ﴾

''اس کا ارشاد عین حق ہے''(16)۔

جب وہ خود حق ہے تو اس کا کہا بھی حق ہونا چاہئے۔ وہ حق بات کہتا ہے اور حق کی دعوت دیتا ہے۔

* اللہ تعالی کا وعدہ حق ہے:

تیسری حقیقت یہ ہے کہ اس کا وعدہ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے ہم سے کئے ہیں وہ سب کے سب حق ہیں، اس کا مشاہدہ وہ دنیا میں بھی کراتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں اس حوالے سے لطیف اشارہ ہے:

....

(14) فصلت 53

(15) الاحزاب 4

(16) الانعام 73

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں جب فرعون بنی اسرائیل کے تمام بچوں کو قتل کررہا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوتی ہیں کہ اس بچے کو کسی بھی وقت فرعون کے سپاہی آکر قتل کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ:

﴿ وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ ﴾

''ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ اس کو دودھ پلا، پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف وغم نہ کر، ہم اسے تیرے پاس واپس لے آئیں گے'' (17)۔

اور پھر وہی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے خطرہ محسوس کرکے انہیں دریا میں بہادیا۔ اس وقت زمینی حقیقت کیا کہہ رہی تھی؟۔ بچہ پانی میں بہتا ہوا اسی کے محل کی طرف جارہا ہے جس کے خوف سے اسے پانی میں بہایا گیا تھا، اب اسے موت سے کون بچا سکتا ہے؟ مگر آسمانی حقیقت نے کچھ اور ہی منظر پیش کیا۔ واقعات سب کو معلوم ہیں، المختصر وہ بچہ ریاستی آب وتاب کے ساتھ اپنی ماں کو واپس کردیا گیا، کیوں؟ اس کی ایک وجہ یہ تھی:

﴿ فَرَدَدْنَاهُ إِلَى أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ﴾

''اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو'' (18)۔

بچے کو ماں کے پاس واپس لانے کی دوسری اور بنیادی وجہ تھی:

....

(17) القصص 7

(18) القصص 13

﴿ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾

''اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا'' (19)۔

اللہ تعالیٰ نے ام موسیٰ علیہ السلام وعدہ کیا تھا کہ اس بچے کو پانی میں بہادے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے تیرے پاس واپس لے آئیں گے، لو ہم نے اپنا وعدہ پورا کردکھا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دکھا دیا کہ وہ جو وعدے اپنے بندوں سے کرتا ہے وہ برحق ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے زمین کی تمکنت اور حکمرانی کا وعدہ کیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں'' (20)۔

اور چشم فلک نے اس وعدے کو بارہا سچا ہوتا دیکھا ہے۔ اہل ایمان اس زمین کے امین، قائد اور حکمراں ہیں، وہ انہیں بارہا اس کی حکمرانی دے چکا ہے اور آج بھی شرائط پورا کرنے پر وہ زمین کی حکمرانی دے گا۔

....

(19) القصص 13

(20) النور 55

* اللہ تعالی سے ملاقات حق ہے:

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، اس کا کہا حق اور اس کا وعدہ حق تو یقیناً اس سے ملاقات بھی حق ہوگی۔

﴿ وَلَوۡ تَرَىٰٓ إِذۡ وُقِفُواْ عَلَىٰ رَبِّهِمۡ قَالَ أَلَيۡسَ هَٰذَا بِٱلۡحَقِّ قَالُواْ بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوقُواْ ٱلۡعَذَابَ بِمَا كُنتُمۡ تَكۡفُرُونَ ﴾

''کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیئے جائیں گے، اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟'' یہ کہیں گے ''ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے'' وہ فرمائے گا ''اچھا! تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو'' (21)۔

* جنت حق ہے:

حق کی پانچویں حقیقت یہ ہے کہ جنت حق ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَنَادَىٰٓ أَصۡحَٰبُ ٱلۡجَنَّةِ أَصۡحَٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقّٗا فَهَلۡ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقّٗا قَالُواْ نَعَمۡ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنُۢ بَيۡنَهُمۡ أَن لَّعۡنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ ﴾

''پھر جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیئے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیئے تھے؟ وہ جواب دیں گے ''ہاں'' تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ان ظالموں پر'' (22)۔

* جنہم حق ہے:

چھٹی حقیقت یہ ہے کہ دوزخ حق ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَيَوۡمَ يُعۡرَضُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ عَلَى ٱلنَّارِ أَلَيۡسَ هَٰذَا بِٱلۡحَقِّ قَالُواْ بَلَىٰ وَرَبِّنَا ﴾

....

(21) الانعام 30

(22) الاعراف 44

’’جس روز کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اس وقت ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ حق نہیں؟ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم یہ واقعی حق ہے‘‘ (22)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا:

﴿ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ، لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾

’’فرمایا تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں تیری پیروی کریں گے‘‘ (24)۔

*انبیاء علیہم السلام سمیت رسول اکرم ﷺ حق ہیں:

ساتویں حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام حق تھے اور آٹھویں حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت حق تھی۔ رسول اکرم ﷺ کی دعوت احقاق الحق کی دعوت تھی۔ فرمایا گیا:

﴿ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ ﴾

’’ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے‘‘ (25)۔

جب یہ تمام حقیقتیں ہمارے دلوں میں زندہ ہو جائیں تو ایک نئی حقیقت کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ حق ہے، اس کا کہا حق ہے، اس کا وعدہ حق ہے، اس سے ملاقات حق ہے، جنت اور دوزخ حق ہیں اور انبیاء سمیت رسول اکرم ﷺ حق ہیں تو پھر مجھے کس لئے پیدا کیا گیا، ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اس حقیقت کو تلاش کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لا تُرْجَعُونَ ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ

....

(23) الاحقاف 34

(24) ص 84، 85

(25) البقرہ 119

الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴾

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں، پس بالا و برتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی، کوئی خدا اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا''(26)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ، مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

''یہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں، ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''(27)۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اس کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ زمین میں عدل قائم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کو قائم کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾

''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی، جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں

....

(26) المؤمنون 115، 116

(27) الدخان 38، 39

یقیناً ان کیلئے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے‘‘ (28)۔

معلوم ہوا کہ خلیفہ کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب کے طور پر اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل قائم کرے اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرے، خواہش نفس کی پیروی اسے اللہ تعالیٰ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ ہونا چاہئے۔ اسی کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے۔

خلیفہ کا مطلب سمجھنے کیلئے ہمیں تخلیقِ آدم علیہ السلام کی طرف جانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کرنا چاہی تو فرشتوں سے کہا:

﴿ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾

’’میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں‘‘ (29)۔

خلیفہ کا مطلب کیا ہے؟۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کی منشا کو پورا کرنا ہے۔

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ کرنا، اس کی توحید کے تقاضے پورے کرنا اور اس کے بندوں کے درمیان عدل قائم کرنا خلیفہ کا کام ہے۔

امام فخر الرازیؒ کا کہنا ہے:

’’خلیفہ اس لئے کہا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتے ہوئے بندوں کے درمیان عدل کے ساتھ

....

(28) ص26

(29) البقرہ 30

فیصلے کرے''(30)۔

''خلیفہ اس لئے کہا گیا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے حدود اور قوانین نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے''(31)۔

زبان میں خلیفہ کا مطلب ہے:

''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام، بعد میں آنے والا، قائم مقام، جانشین، نائب''(32)۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں کہ:

''انسان مطلق التصرف نہیں کہ وہ جو چاہے کرتا رہے اور اس کا مؤاخذہ نہ ہو بلکہ وہ اپنے خالق کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ زمین کو آباد کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ خلیفہ کا مقام دے کر اس کی عزت وتکریم کی گئی جس پر سفلی اور علوی مخلوقات نے اس پر رشک کیا''۔

واضح رہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یعنی نائب ہے اور دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کا سب سے قریبی شخص اس کا نائب ہوتا ہے۔ یہ دنیا اس کے لئے پیدا ہوئی، آخرت اس کے لئے دارالجزاء قرار پائی، شیطان اس پر تکبر کرنے کے باعث ملعون ہوا اور فرشتے اس کی تکریم میں سجدہ ریز ہوئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لئے اس کی جگہ لے۔ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملے میں کچھ

....

(30) مفاتیح الغیب، از علامہ رازیؒ۔

(31) تفسیر فتح البیان۔

(32) فیروز اللغات

اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ وہ ان اختیارات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا وہ مطلق العنان بن کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے"(33)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان فضول پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے جس کے ذمہ کچھ کام ہیں جنہیں ادا کر کے وہ آخرت میں سرخرو ہوگا یا ان میں کوتاہی برتنے پر سزا کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ اللہ تعالیٰ " الحق " ہے اور اس کا حق ہے اس کا نظام دنیا میں چلے، اس کا حکم مانا جائے اور اس کی اطاعت و بندگی کی جائے۔ انسان " الحق " کا خلیفہ اور نائب ہے اور اس پر فرض عائد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتے ہوئے زمین میں عدل کرے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً ﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر کیوں نہ پڑتی ہو، فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو، اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے"(34)۔

اقامت عدل کے حوالے سے اسلامی تاریخ روشن ہے۔ مخزوم قبیلے سے تعلق رکھنے والی ایک عورت نے چوری کی تو لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ اتنے بڑے قبیلے سے تعلق رکھنے والی عورت کے ہاتھ

....

(33) تدبر القرآن

(34) النساء135

کاٹے جائیں۔لوگوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کرنے کیلئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس روانہ کیا۔حضرت اسامہؓ کی سفارش پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخت برہم ہوئے اور فرمایا:

''تم مجھ سے اللہ کے حدود کے متعلق سفارش کرنے آئے ہو؟ اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا'' (35)۔

عدل اور حق کے علمبردار انصاف کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں خواہ اس کی زد خود ان پر کیوں نہ پڑتی ہو۔فتح سمرقند حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ہوا۔فوج نے سمرقند کے باسیوں کو تین دن کی مہلت دی مگر مہلت کے دوران ہی فوج نے حملہ کر کے شہر کو فتح کرلیا۔اہالیان سمرقند حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دربار میں حاضر ہوئے اور شکوہ کیا کہ مسلمان فوج نے انہیں تین دن کی مہلت دی مگر مہلت کے دوران ہی ان پر حملہ کر کے شہر کو فتح کرلیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مفتوحہ شہر سے فوج کو انخلاء کا حکم دیا۔اس طرح کے واقعات سے اسلامی تاریخ روشن ہے۔

حق کے علمبردار جب حق کا علم لے کر اٹھتے ہیں تو دنیا کی مخالفت انہیں حق کی علمبرداری سے نہیں روک سکتی۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تمام تر مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کو نہیں چھوڑا۔سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے وفد کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تب بھی میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا'' (36)۔

....

(35)حدیث صحیح: بروایت حضرت عائشہؓ مسلم 1688، بخاری 4304

(36)حدیث ضعیف: بروایت یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ، علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے، دیکھئے: السلسلة الضعیفه 909، نیز ''فقه السیره'' میں بھی اسے ضعیف کہا گیا، دیکھئے: فقه السیره 109

اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کا تقاضا یہ ہے کہ اسے غالب کیا جائے۔حق ،حق ہے اوراس کا حق ہے کہ اسے غالب کیا جائے۔حق دراصل غالب ہونے کیلئے ہی آیا ہے۔

اس وقت مسلم امہ جس کسمپرسی کے عالم میں ہے اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس نے حق کو غالب کرنے کی جدو جہد کو ترک کر دیا ہے۔آج دنیا کو نظر آرہا ہے کہ باطل کا غلبہ ہے اور حق مغلوب ہے مگر باطل کا یہ غلبہ جھاگ کے سوا کچھ نہیں۔اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَّابِياً وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاء حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاء وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الأَمْثَالَ ﴾

’’اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لئے لوگ پگھلایا کرتے ہیں، اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے، جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین پر ٹھہر جاتی ہے، اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے‘‘(37)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین میں باقی رہنے والی چیز ہی حق ہے کیونکہ وہی لوگوں کیلئے نافع ہے۔

جب آدمی حق کا علمبردار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتے ہوئے حق کو ظاہر کرتا ہے:

﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ﴾

’’ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے‘‘(38)۔

....

(37)الرعد17 (38)الانبیاء18

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سواری پر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے اور اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟''۔

میں نے عرض کیا:

''اللہ اور رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں''۔

فرمایا:

''اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں سزا نہیں دے گا'' (39)۔

اس حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ حق قیامت تک کے لئے رہے گا۔ جس دن اس زمین سے حق اٹھ گیا، اسی دن قیامت برپا ہوگی۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں بھی دستیاب ہے۔

....

(39) حدیث صحیح: بروایت حضرت معاذ بن جبلؓ، ابن ماجہ 3487، علامہ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الجبار

سورۃ الحشر کی آیت 23 میں فرمایا گیا:

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

''وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہوکر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں''۔

الجبار اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں مذکورہ آیت میں ہوا ہے۔ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نام کو سن کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اس کا مطلب جبر، عظمت، کبریائی وغیرہ ہی ہے۔ عام آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے اس مبارک نام میں بے کسوں، مجبوروں، محتاجوں اور مریضوں کیلئے انتہائی رحمت وشفقت پوشیدہ ہے۔

الجبار کا مادہ ''جبر'' سے ماخوذ ہے جس کے 4 معانی ہیں۔

* اولاً: جبر، یعنی اکراہ اور زبردستی۔

*دوم: عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی۔

عربی زبان میں کھجور کے اس درخت کو جبار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کے پھل توڑنا کسی کے لئے آسان نہ ہو۔ اسی طرح کوئی کام جو بڑا عظیم الشان ہو وہ ''عملِ جبار'' کہلاتا ہے۔

*سوم: الجبار کا مطلب کبریائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا'' (1)۔

یعنی مجھے تکبر کرنے والا نہیں بنایا۔

* چہارم: اصلاح، یعنی وہ جو فقر سے غنا دیتا ہے، ٹوٹے کو جوڑتا ہے، مریض کو شفا دیتا ہے، ضعیف اور کمزور کو تقویت دیتا ہے، محتاج و بے کس اور مجبور کی مدد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنٰی کے طور پر یہ نام قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر آیا ہے (2) جبکہ رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی یہ نام اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، رسول رحمت ﷺ کا گرامی قدر ارشاد ہے:

تَكُونُ الْاَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُبْزَةً وَاحِدَةً ، يَتَكَفَّأُهَا الْجَبَّارُ بِيَدِهِ كَمَا يَتَكَفَّأُ اَحَدُكُمْ خُبْزَتَهُ فِيْ السَّفَرِ

''قیامت کے دن یہ زمین الجبار کی مٹھی میں اس طرح ہوگی جس طرح تم سفر کے وقت روٹی اپنی مٹھی میں پکڑتے ہو'' (3)۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں:

''ایک رات میں نے رسول اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے الفاتحہ کے بعد سورہ البقرہ کی تلاوت کی، کوئی رحمت کی آیت ایسی نہیں تھی جس پر رک کر آپ ﷺ نے اللہ تعالی سے رحمت کا سوال نہیں کیا اور کوئی عذاب کی آیت ایسی نہیں تھی جس پر رک آپ ﷺ نے اللہ تعالی سے پناہ نہیں مانگی۔ بعد ازاں آپ ﷺ رکوع میں گئے تو جس قدر آپ ﷺ نے قیام کیا اسی قدر رکوع کیا،

....

(1) مریم 32

(2) سورہ الحشر کی آیت 23

(3) حدیث صحیح: صحیح الجامع از علامہ ناصر الدین الالبانیؒ 2988

آپ ﷺ رکوع میں یہ دعا کرتے رہے:

سُبْحَانَ ذِیْ الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَکُوْتِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْعَظَمَۃ

''پاک ہے وہ ذات جو جبروت، ملکوت، کبریائی اور عظمت والی ہے''۔

بعدازاں آپ ﷺ سجدے میں گئے اور آپ ﷺ نے قیام جتنا سجدہ کیا، اس میں بھی آپ ﷺ وہی دعا دہراتے رہے''(4)۔

حدیث بالا میں جہاں ''الجبار'' کا بطور اسماء الحسنی ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تہجد کی نماز ہوگی جس میں آپ ﷺ کا رکوع اور سجود اس قدر طویل تھا جس قدر وقت سورہ البقرہ کی تلاوت میں لگتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک اور دعا کے الفاظ ہیں:

''اے اللہ تعالیٰ! اے جبار، اے زبردست قوت وطاقت والے، تجھے یاد کرنے میں، تیرا شکر ادا کرنے میں اور تیری احسن طریقے سے عبادت کرنے میں ہماری مدد فرما''(5)۔

ان مبارک حدیثوں میں بھی ''الجبار'' بطور اسم اللہ تعالیٰ استعمال ہوا ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ الجبار کے 4 مفہوم ہیں۔ پہلا اکراہ اور زبردستی۔ دوسرا عزت، جبروت، عظمت، بلندی اور برتری۔ تیسرا کبریائی اور چوتھا اصلاح۔ اب آیئے ان معانی کی تشریح کرتے ہیں:

جبر، اکراہ اور زبردستی:

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظم ونسق بزورِ دست قائم کر رکھا ہے۔ وہ اپنے ارادے کو جو سراسر حکمت پر

....

(4) حدیث صحیح: بروایت حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ، مسند احمد 6/24، ابوداؤد 873، نسائی 1132

(5) یہ دعا بلفظہ محمد ایوب سپرا کی کتاب ''الاسماء الحسنی'' صفحہ 90 سے نقل کی گئی ہے۔ موصوف نے اسے احمد اور ابوداؤد سے ماخوذ قرار دیا ہے جبکہ یہ حدیث مجھے کہیں نہیں ملی۔

منی ہوتا ہے جبراً نافذ کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ اِئْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴾

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا: ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح''(6)۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾

''وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ حکم دے کے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے''(7)۔

فرشتوں پر اس کا جبر دیکھئے:

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ﴾

''بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں''(8)۔

رب سبحانہ وتعالی جو الجبار ہے، اس نے اپنا جبر فرشتوں پر بھی نافذ کر رکھا ہے حالانکہ فرشتوں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

اُذِنَ لِیْ اَنْ اُحَدِّث عَنْ مَلَکٍ مِنْ مَلائِکَةِ اللّٰهِ تَعَالَیٰ حَمَلَةِ الْعَرْشِ، مَابَیْنِ شَحْمَةِ اُذُنِهٖ اِلَیٰ عَاتِقِهٖ مَسِیْرُۃُ سَبْعَمَائَةَ سَنَة

....

(6)حم سجدہ11

(7)یٰسین82

(8)الرعد13

''مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں عرش اٹھانے والے فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے بارے میں بتاؤں، اس کے کندھے اور کان کی لو کے درمیان 700 سال کے سفر کی مسافت ہے'' (9)۔

معلوم ہوا کہ اتنا عظیم فرشتہ ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس کے باوجود اللہ تعالی کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہی جبر تمام کائنات پر نافذ ہے، اس نے انسان وجن کو چیلنج کیا ہے:

﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴾

''اے گروہِ جن وانس! اگر تم زمین اور آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دیکھو، نہیں بھاگ سکتے، اس کے لئے بڑا زور چاہئے'' (10)۔

کائنات کی ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا جبر چل رہا ہے مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لئے تو پیدا کیا مگر اسے عبادت پر مجبور نہیں کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو زمین پر تمام انسان مومن بن جاتے مگر اس نے اختیار کی آزادی عطا کی ہے تاہم اس کی مشیت نافذ ہے لہذا مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو تسلیم کرے۔

اثر میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میرے بندے! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت اور ہوگا وہی جو میری چاہت ہے، اگر تو نے حوالے کیا اپنے آپ کو اس کے جو میری چاہت ہے تو میں وہی کروں گا جو تیری چاہت ہے اور

....

(9) حدیث صحیح: بروایت حضرت جابر بن عبداللہؓ، صحیح الجامع از علامہ ناصر الدین الالبانیؒ 854، نیز اسے امام ابوداؤد نے بھی نقل کرتے ہوئے اس پر خاموشی اختیار کی اور اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں کہا جس حدیث پر خاموشی اختیار کی جائے وہ صحیح ہے۔ دیکھے: ابوداؤد 4727، العلو 97، مجمع الزوائد 1/85

(10) الرحمٰن 33

اگر تو نے نہ کیا وہ جو میری چاہت ہے تو میں تجھے تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے، پھر بھی ہوگا وہی جو میری چاہت ہے“(11)۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے انسان سراسر بے بس ہے۔ مومن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کو برضا و رغبت تسلیم کرے۔ روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار تھا۔ اس نے پہاڑ کی کھوہ میں اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل تھا، لوگ بھی اس کی نظروں سے دور تھے۔ اس کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے وہ وضو کرتا، اپنی تشنگی دور کرتا اور نباتات سے اپنی غذا حاصل کرتا تھا۔ دن کو روزے سے رہتا اور رات اللہ تعالیٰ کو عبادت میں گزارتا۔ اس کا ہر پل اور ہر لمحہ اطاعت و بندگی کی نذر ہوتا تھا چنانچہ سعادت و کامرانی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عبادت گزار کی خبر ہوئی تو آپؑ ایک دن اس کے پاس پہنچے لیکن اسے نماز اور ذکر و اذکار میں مشغول دیکھ کر واپس چلے گئے، پھر رات کو اس کے پاس گئے تو اسے عزیز و غفار رب العالمین کے دربار میں سرگوشی و مناجات میں مگن پایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا اور فرمایا:

”جناب والا! اپنے آپ پر نرمی کیجئے!“۔

عبادت گزار بندے نے کہا:

”اے اللہ کے نبی! مجھے خدشہ ہے کہ مبادا اچانک غفلت میں انتقال کر جاؤں اور اپنے پروردگار کے حضور مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے“۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

”کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟“۔

....

(11) یہ بے اصل ہے۔ بعض مشائخ اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔

عبادت گزار نے کہا:

''آپ میرے لئے پروردگار سے اس کی رضا وخوشنودی کی دعا کر دیں اور میری یہ التجا بھی پہنچا دیں کہ وہ مجھے زندگی بھر صرف اپنی ہی خوشنودی کے کاموں میں مشغول رکھے حتیٰ کہ میں اس سے جاملوں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب رب سبحانہ وتعالیٰ سے ملاقات اور شرف کلام حاصل کرنے گئے تو دعا و مناجات میں مشغول ہو گئے اور اپنے مولیٰ سے لذتِ کلام میں اس قدر ڈوب گئے کہ اُس عبادت گزار کی باتیں یاد ہی نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا:

''آپ سے میرے عبادت گزار بندے نے کیا کہا تھا؟''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

''میرے پروردگار! تو ہی زیادہ جانتا ہے۔ اس نے تیری رضا وخوشنودی طلب کی ہے اور یہ درخواست بھی کی ہے کہ اس کی زندگی تیری ہی یاد میں گزرے حتیٰ کہ وہ تیرے دربار میں حاضر جائے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

''اے موسیٰ! اس عبادت گزار کے پاس جایئے اور کہئے کہ رات دن جتنی عبادت چاہے کر لے لیکن ہے وہ بہرحال جہنمی کیونکہ میرے صحیفے میں اس کا نام گناہ گاروں کی فہرست میں درج ہے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس عابد کے پاس گئے اور پروردگار کے فیصلے سے اسے آگاہ کیا تو عابد نے کہا:

''سبحان اللہ! میں اپنے پروردگار کے فیصلے کو خوش آمدید کہتا ہوں، ہر چیز میرے پروردگار کے فیصلے کے مطابق رواں دواں ہے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کے فیصلے کو کوئی روک نہیں سکتا''۔

یہ کہہ کر وہ عبادت گزار زور زور سے گریہ وزاری کرنے لگا...... پھر کچھ دیر کے بعد بولا:

''اے موسیٰ! میرے پروردگار کے جاہ وجلال اور عزت وشان کی قسم! میں اس کے در سے پلٹنے والا

نہیں اور اس فیصلے کو سن کر ہرگز مایوس نہیں بلکہ اب اپنے پروردگار سے میری محبت دوبالا ہوگئی ہے‘‘۔

کچھ عرصے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ اپنے پروردگار سے دعا و مناجات میں مشغول ہوئے تو عرض کیا:

’’میرے رب! جو کچھ تیرے عبادت گزار بندے نے کہا ہے اس سے تو اچھی طرح واقف ہے‘‘۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’اے موسیٰ! میرے اس بندے کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ وہ جنتی ہے۔ میری رحمت نے اسے جا لیا۔ اُسے یہ بھی بتا دیجئے کہ اس نے میرا یہ خوش کن فیصلہ اپنے صبر و رضا کے عوض حاصل کیا ہے کیونکہ میرا سابقہ کڑوا فیصلہ سن کر بھی وہ چیں بہ جبیں نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ آسمان و زمین بھر گناہ بھی ساتھ لائے تب بھی میں اسے بخش دوں گا، میں کریم اور غفار ہوں‘‘۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خوشخبری اس عبادت گزار کو سنائی تو وہ سجدے میں گر گیا، پروردگار کی حمد و ثنا کرنے لگا پھر اس طویل سجدے ہی میں اُس نے اپنی جان، جاں آفریں کے حوالے کر دی(12)۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ عبادت گزار بندے کو جب اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام جہنمیوں میں لکھ دیا ہے تو اس نے قضائے الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت قرار دیا نیز یہ بھی کہا:

’’اے موسیٰ! میرے پروردگار کے جاہ و جلال اور عزت و شان کی قسم! میں اس کے در سے پلٹنے والا نہیں‘‘۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو سن کر اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اسے گھیر لیا اور اس کا نام جنتیوں میں شامل کر لیا۔ اس واقعے میں سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں، ان فیصلوں کو ہم آہ و زاری سے تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو

....

(12) یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے جبکہ اسرائیلی روایات کے بارے میں حکم ہے کہ نہ اس کی تصدیق کرو نہ اس کی تکذیب کرو۔

پھر مشیت الٰہی کو قبول کیا جائے اور اس کی حکمت پر صبر کیا جائے کہ اس میں ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے۔

عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی:

الجبار کا دوسرا مفہوم عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ﴾

''اللہ تعالیٰ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں'' (13)۔

اس کی جباریت دیکھئے کہ جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ ارشاد ہوا:

﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء ﴾

''کہو اے اللہ! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے'' (14)۔

اس سے کون پوچھ سکتا ہے:

﴿ لاَ يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴾

''وہ اپنے کاموں کے لئے کسی کے آگے جواب دہ نہیں اور سب جواب دہ ہیں'' (15)۔

اللہ تعالیٰ عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی والا ہے جبکہ تمام مخلوق اس کے محتاج ہیں، کوئی نہیں جو اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکتا ہو۔

....

(13) الرعد 41

(14) آل عمران 26

(15) الانبیاء 23

کبریائی:

الجبار اللہ تعالیٰ کے لئے صفت مدح ہے جبکہ انسانوں کے لئے یہ صفت مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ ''الجبار'' اسلئے ہے کہ وہ اپنی صفات میں کامل واکمل ہے جبکہ انسان ناقص اور محکوم ہے، مکھی اسے پریشان کردیتی ہے، مچھر اسے نقصان دے سکتا ہے، وہ بھوک کے آگے مجبور ہے اور خواہشات کا غلام ہے۔ انسان جب جبار اور متکبر بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سخت ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد میں یہ صفت پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے عبرت کا نشان بنادیا۔

حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴾

''اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو'' (16)۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت سزا دے کر فرمایا:

﴿ وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُواْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْاْ رُسُلَهُ وَاتَّبَعُواْ أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴾

''یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمنِ حق کی پیروی کرتے رہے'' (17)۔

انسان جب دنیا میں جبار بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگادیتا ہے:

﴿ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾

''اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگادیتا ہے'' (18)۔

سورہ ابراہیم میں فرمایا:

....

(16) الشعراء 130

(17) ہود 59   (18) المومن 35

﴿ وَاسۡتَفۡتَحُوۡا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ﴾

''انہوں نے فیصلہ چاہا تھا تو یوں ان کا فیصلہ ہوا اور ہر جبار دشمنِ حق نے منہ کی کھائی'' (19)۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''قیامت کے دن جہنم سے ایک سر انکلے گا جس کی دو آنکھیں ہوں گے جن سے وہ دیکھے گا، دو کان ہوں گے جن سے وہ سنے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا، وہ کہے گا مجھے تین قسم کے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے، ہر جبار اور تکبر کرنے والے کے لئے، اس شخص کے لئے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور بھی الہ بنالیا اور تصویریں بنانے والوں کے لئے'' (19)۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان مکالمہ ہوا تو دوزخ نے کہا:

''مجھے تکبر اور زمین میں جبار بننے والوں کے لئے بنایا گیا ہے'' (20)۔

اللہ تعالیٰ کو '' قاسم الجبابرة'' بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ جو دنیا میں ہر جبار کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ دنیا میں کئی جبار بنے جنہیں اللہ تعالی نے عبرت کا نشان بنادیا۔ ان میں سے ایک نمرود بھی تھا جو ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا تھا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہے تو اس نے کہا:

﴿ قَالَ أَنَا أُحۡيِۦ وَأُمِيتُ ﴾

''زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے'' (21)۔

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ چار افراد ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں پر حکومت کی تھی۔ ان میں

....

(19) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، مسند احمد 2/336، ترمذی 2574

(20) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، بخاری 4850، مسلم 2846

(21) البقرہ 258

سے دومومن (حضرت سلیمان علیہ السلام اوراور ذوالقرنینؒ) اور دو کافر (نمرود اور بخت نصر) تھے۔ نمرود ان چار میں سے ایک تھا جس نے پوری دنیا پر حکمرانی کی تھی۔ اللہ تعالی نے اس کے غرور کو خاک میں ملانے کیلیئے اس پر اپنی ایک حقیر مخلوق مچھر کو مسلط کر دیا جو اس کی ناک سے دماغ میں گھس گئی۔ اس کی وجہ سے نمرود کا سر درد کی وجہ سے پھٹا جاتا تھا۔ اسے اس وقت سکون ملتا تھا جب سر پر جوتے پڑتے تھے۔ انہی جوتوں کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا ہے:

''کبریائی اور عظمت میری چادریں ہیں، جو مجھ سے میری چادر چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں پھینک دوگا'' (22)۔

اصلاح کرنے والا:

الجبار کا چوتھا مفہوم یہ ہے: جو اپنے بندوں کے معاملات کی اصلاح کرتا ہے۔ فقیر کا جبر غنا ہے، ٹوٹے ہوئے دل کا جبر جوڑنا ہے، ضعیف کا جبر قوت دینا ہے، مریض کا جبر شفا ہے، بے کس، مجبور محتاج کا جبر اس کی ضرورت پورا کرنا ہے۔ ان تمام باتوں میں اللہ تعالیٰ ''الجبار'' ہے، یعنی وہ جو اپنے بندوں کے معاملات کی اصلاح کرتا ہے۔

انسان کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو ڈاکٹر اس پر پلاستر چڑھا دیتے ہیں۔ اس پلاستر کو عربی زبان میں ''جبیرہ'' کہا جاتا ہے۔ جبار انسان کے لئے مذموم ہے جبکہ اللہ کے لئے محمود صفت ہے۔

جبار ٹوٹے ہوؤں کو جوڑنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ نام غمزدوں، بے کسوں، مظلوموں، یتیموں، بے آسراؤں اور بے سہاروں کے لئے ہے۔ جبار وہ ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جبار کا اصل جبیرہ سے نکلا ہے اور جبیرہ پلاستر کو کہتے ہیں جو ہڈی ٹوٹ جانے پر چڑھایا جاتا ہے۔ انسان

....

(22) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، صحیح الجامع، از علامہ ناصرالدین الالبانیؒ 4311

کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور دل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ڈاکٹر ہڈیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جوڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔

مشہور دعا ہے:

یَا جَابِرَ کُلِّ کَسِیْر

''اے ٹوٹے ہوؤں کو جوڑنے والے''۔

دو سجدوں کے درمیان رسول اکرم ﷺ کی دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ، وَ ارْحَمْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ

''یا اللہ میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم کر، میری اصلاح فرما، مجھے بلندی عطا کر، مجھے ہدایت دے، مجھے عافیت اور رزق عطا کر'' (23)۔

جابر اور جبار میں فرق یہ ہے کہ جابر وہ ہے جو ایک آدھ مرتبہ آپ کی اصلاح اور مدد کرے مگر جبار وہ ہے جس کی طرف جب جب آپ رجوع کریں وہ آپ کی مدد اور اصلاح کرے گا۔انسان کا نام جابر تو ہوسکتا ہے مگر جبار نہیں ہوسکتا۔دنیا میں کوئی بے کس، منکسر اور مجبور الجبار سے رجوع کرے گا تو وہ اس کی بے کسی کو دور کردے گا مگر ستم یہ ہے کہ کوئی ٹوٹ جائے مگر الجبار سے رجوع نہ کرے۔

دل جب ٹوٹ جائے تو انکساری سے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش آنا چاہئے اور انکساری کی تعلیم خود رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں ملتی ہے۔طائف کا واقعہ ہمارے کے سامنے ہے۔رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہاں جو ستم پیش آیا تھا اس وقت آپ ﷺ کی عمر 50 سال تھی۔آپ ﷺ نے اس وقت جو دعا کی اس میں کمالِ انکساری تھی:

'' اَللّٰھُمَّ اَشْکُوْ اِلَیْکَ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّةَ حِیْلَتِیْ ، وَھَوَانِیْ عَلَیٰ النَّاس ....''

....

(23)حدیث صحیح: بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، جامع ترمذی 284، ابن ماجہ 898

''اے اللہ میں تجھ سے اپنی کمزوری، بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں''۔

گویا طائف والوں کے رویئے سے آپ ﷺ کا دل ٹوٹ گیا تھا مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا جبر دیکھیے ،اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو پیغام دے رہے ہوں کہ اگر زمین والوں نے آپ ﷺ کی قدر نہ کی تو آسمان والوں کے ہاں آپ ﷺ کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

اسرائیلیات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا:

''یارب میں تمہیں تلاش کرنا چاہوں تو کہاں پاؤں گا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ

''میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل ٹوٹ جاتے ہیں''۔

انسان بسا اوقات ایسے حادثات سے دوچار ہوتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو کیسے سنبھال رکھا ہے۔ ایسے لوگ بارہا ہم نے دیکھے جن کے تمام احباب ایک ہی حادثے میں جاں بحق ہوجاتے ہیں اور سب کی لاشوں کو وہ کندھا دیتا ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اتنا بڑا سانحہ وہ کیسے برداشت کررہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ میں تجھے تلاش کرنا چاہوں تو کہاں پاؤں گا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل ٹوٹ جاتے ہیں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں تو وہ بکھر جائیں گے''(24)۔

اثر میں آیا ہے کہ:

....

(24)اسرائیلی روایت

''کمزور اور بے کس اللہ کی نگرانی میں ہوتے ہیں''۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

''اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے ساتھ اٹھا'' (25)۔

الجبار کے دو پہلو ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے جبار یعنی جوڑنے والا ہے اور وہ دنیا میں متکبر بننے والوں پر جبار یعنی توڑنے والا ہے۔

اللہ تعالی کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ ہے اس لئے والدین کے ساتھ انکساری سے پیش آنا چاہئے۔ جبار کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ والدین کے حوالے سے آیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زبانی:

﴿ وَبَرّاً بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُن جَبَّاراً عَصِیّاً ﴾

''وہ اپنے والدین کا حق شناس تھا، وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان'' (26)۔

اور دوسری مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی:

﴿ وَبَرّاً بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّاراً شَقِیّاً ﴾

....

(25) اس حدیث پر محدثین کلام کیا ہے۔ یہ حدیث بلفظہ سنن ترمذی میں ہے جسے حضرت انسؓ سے روایت کیا گیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ حدیث غریب ہے، دیکھئے: سنن ترمذی 2352۔ امام ابن ماجہ نے اسے اپنی کتاب میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کی اکثریت نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اسے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے جس کی سند ثابت نہیں کیونکہ اس کے رواۃ میں یزید بن سنان ہے جو بہت ہی کمزور ہے۔ واضح رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں مسکین کا مطلب مفلسی نہیں بلکہ تواضع اور انکساری ہے۔

(26) مریم 14

''اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا'' (27)۔

معلوم ہوا کہ والدین کے ساتھ جبار بن کر پیش آنے کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ہمیں اللہ تعالی کے مبارک نام الجبار کے بارے میں معلوم ہوا کہ الجبار کے چار معانی ہیں۔

* اولاً: جبر، یعنی اکراہ اور زبردستی۔

* دوم: عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی۔

* سوم: الجبار کا مطلب کبریائی ہے۔

اور الجبار کا چھوتھا اور سب سے خوبصورت مطلب ہے:

* اصلاح، یعنی وہ جو فقر سے غنا دیتا ہے، ٹوٹے کو جوڑتا ہے، مریض کو شفا دیتا ہے، ضعیف اور کمزور کو تقویت دیتا ہے، محتاج و بے کس اور مجبور کی مدد کرتا ہے۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں بھی دستیاب ہے۔

....

(27) مریم 32

الفتاح

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام الفتاح ہے۔ یہ مبارک نام ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دلاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ، وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾

''کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے''(1)۔

''الفتاح'' اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ہے جس کا مطلب مشکلوں کو حل کرنے والا، مزاحمتوں کو دور کرنے والا، وہ جو اپنے بندوں پر رحمتوں کے دروازے کھولتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ الفتاح زبردست حاکم اور ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو کھولنے کا حکم دیتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کا کہنا ہے:

''حق و باطل کھول کر بیان کرنے والا، حق کو ظاہر اور باطل کو گم کرنے والا، حکم دینے والا اور جسے کوئی حکم نہ دیتا ہو۔ الفتاح وہ ہے جو دل کو حق کے لئے کھولتا ہے اور زبان پر علوم جاری کرتا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فیصلہ کرتا ہے، جو صادقین کا صدق اور کاذبین کا کذب ظاہر کرتا ہے''۔

علامہ خطابیؒ کہتے ہیں:

....

(1) سبا26

''الفتاح وہ ہے جو اپنے بندوں کیلئے رزق کے دروازے کھولتا ہے''۔

ان اجمالی معانی ومفاہیم کو سامنے رکھا جائے تو الفتاح کے تین تفصیلی معانی واضح ہوتے ہیں:

* پہلا مفہوم:

الفتاح وہ ہے جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے۔الفتاح وہ ہے جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے۔

* دوسرا مفہوم:

وہ جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

* تیسرا مفہوم:

الفتاح اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

اب آیئے پہلے مفہوم پر غور کرتے ہیں:

جب بندہ مسائل،مشکلات اور مصیبتوں کے طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو کون ہستی ہے جو اسے ان پریشانیوں سے نجات دلاتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر مشکلات کو دور کرتے ہوئے اپنے بندے کی مدد کرتا ہے۔درج ذیل آیت ہم نے بار ہا پڑھی ہوگی مگر اب ذرا اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کیجئے:

﴿ مَايَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلا مُمْسِکَ لَهَا، وَمَايُمْسِکْ فَلامُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾

''اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لئے کھول دے،اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کردے اسے اللہ کے بعد پھر دوسرا کھولنے والا نہیں''(2)۔

اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جب ہم فلاں مصیبت میں گھر گئے تھے، جب تمام

....

(2)فاطر 2

دروازوں پر دستک دے کر مایوس ہو گئے تھے، جب تمام دروازے بند ہو گئے تھے تو آخر وہ کون تھا جس نے ہمیں اس پریشانی سے نجات دلائی تھی؟۔ وہ الفتاح سبحانہ وتعالیٰ تھا۔

آیت مذکورہ پر غور کریں، جب اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر اپنے کسی بندے کیلئے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے، کون ہے جو اس دروازے کو بند کر سکتا ہے؟۔ اور جب وہ کوئی دروازہ بند کر دے تو کون ہے جو اسے کھول سکتا ہے؟۔ اس معنی کو واضح کرنے کیلئے کئی واقعات ہمیں ملتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے ایک واقعہ پیش خدمت ہے:

غزوہ بدر حق وباطل کے درمیان پہلا معرکہ تھا جس میں رسول اکرم ﷺ نے 15 سال کی محنت کے بعد 313 صحابہ کرامؓ کو میدان بدر میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان کے پاس وسائل نہیں تھے، اسلحہ کی کمی تھی، سامانِ حرب کی قلت تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ عدو تین گنا بڑا تھا۔ غور کیجئے کہ جب مشکلات ومصائب بندے پر ٹوٹ پڑیں اور وہ چاروں طرف سے پریشانی میں گھر جائے تو رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر اس کی مدد کرتا ہے۔ میدان بدر میں اس سے ملتے جلتے حالات تھے۔

جس صبح کو حق وباطل کے درمیان معرکہ پیش ہونا تھا، اس رات کو رسول اکرم ﷺ نے کیسے گزارا تھا؟۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ وہ رات اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا میں گزاری تھی، رسول اکرم ﷺ انتہائی عاجزی سے رب کو پکار کر کہتے رہے:

''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ سچا کر دکھا''۔

آپ ﷺ دعا مناجات کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

''اے اللہ! (یہ 313 میری عمر بھر کی کمائی ہے) اگر یہ لوگ ہلاک ہو گئے تو پھر زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہو گا''۔

آپ ﷺ یہ دعا اس عاجزی وانکساری سے ہاتھ بلند کر کے کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی

چادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کندھوں سے گر گئی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت صدیق اکبرؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترس آ گیا۔ آپؓ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے حال پر رحم فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور سچا ہوگا''(3)۔

اور پھر دیکھئے کہ رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر کس طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ابوبکرؓ! خوش ہو جائیے، یہ جبریل امینؑ ہیں، اپنے گھوڑے کی لگام تھامے فرشتوں کے ایک ہزار لشکر کی قیادت کر رہے ہیں''۔

پھر چشم فلک نے دیکھا کہ کس طرح مکہ نے اپنے جگر گوشے اگل دیئے اور کس طرح مسلمانوں نے کفر کے اکابرین کو کاٹ کر رکھ دیا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کو کون نہیں جانتا۔ امام محترم اپنے وقت کے ممتاز علماء اور امام ابن قیمؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کے علاوہ کئی جید علماء کے استاد تھے۔ آپؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب آپؒ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، جب کوئی گتھی الجھ جاتی، جب کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تو عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنا گال مٹی پر رکھ دیتے اور دیر تک اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے، پھر دعا کرتے:

''اے اللہ! (یہ لوگ مجھے امام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں حالانکہ) میں کچھ بھی نہیں ہوں، اے میرے رب! یہ مسئلہ درپیش ہے جسے تو ہی حل کر سکتا ہے''۔

کہتے ہیں:

''اللہ کی قسم! جب میں مٹی سے اپنا گال اٹھاتا تو اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کا حل میرے دل میں القا کر دیتا''۔

....

(3) دیکھئے: کتب سیر۔

ہم نے کہا الفتاح وہ ہے جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے۔

* دوسرا مفہوم:

وہ جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ پہلا مفہوم یہ تھا کہ جب مصیبت آجائے اور بندہ اس میں گرفتار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر اسے اس پریشانی سے نجات دلاتا ہے جبکہ دوسرے مفہوم کا مطلب یہ ہے کہ ابھی پریشانی نہیں آئی، مصیبت کا وقت نہیں ہوا، وہ رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر پیشگی اس سے نجات دلانے کا بندوبست کرتا ہے۔ درج ذیل آیت کو بھی ہم نے بارہا پڑھا اور سنا ہے، اس پہلو سے اس پر غور کریں:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَايَعْلَمُهَآ اِلاَّ هُوَ ﴾

''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا'' (4)۔

غیب کی ساری کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ جانتا ہے کہ میرے بندے کے حق میں بہتر کیا ہے، اسی کو مدنظر رکھ کر وہ اپنے بندوں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے۔ آیت مذکورہ میں (عِنْدَهٗ) کا لفظ پہلے آیا ہے، اگر یہ بعد میں آتا، مثال کے طور پر اگر یوں آتا:

وَ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ عِنْدَهٗ یعنی (عِنْدَهٗ) کا لفظ آخر میں آتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ ''غیب کی کنجیاں اس کے پاس بھی ہیں اور دوسروں کے پاس بھی ہو سکتی ہیں'' لیکن (عِنْدَہ) کو پہلے لا کر اس حقیقت کی طرف نشاندہی کی گئی کہ غیب کی کنجیاں صرف اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ انسان سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے جب یہ سمجھنے لگتا ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو بھی ہو سکتا ہے۔

آنے والے خطرات سے آدمی ڈرتا ہے اور اس سے پیشگی محفوظ رہنے کیلئے دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہے

....

(4) الانعام 59

حالانکہ پیشگی حفاظت کا انتظام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہ اپنے کرم سے الفتاح بن کر اپنے بندوں کی بہتری کے فیصلے کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی کو مستقبل کے بارے میں کسی قسم کا خدشہ ہو اور وہ آنے والی ممکنہ مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اسے الفتاح سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی تعلیم ہمیں صلاۃ الاستخارہ میں بھی دی گئی ہے۔

* تیسرا مفہوم:

وہ جو اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ، وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾

''کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے'' (5)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا

﴿ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ ﴾

''اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے'' (6)۔

جب کسی پر ظلم کیا جائے، جب کسی کا حق مارا جائے اور اس پر بے جا الزام لگایا جائے تو کون ہے جو مظلوم کو اس کا حق دلواتا ہے؟۔ کون ہے جو حق کو حق ظاہر کرتا ہے اور باطل کو باطل، جو صادقین کا صدق اور کاذبین کا کذب واضح کرتا ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر بہتان باندھا گیا تھا، اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے سیدہؓ کے پاس کوئی

....

(5) سبا 26

(6) الاعراف 89

ثبوت نہیں تھا۔ واقعہ افک کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ خود اپنے بارے میں کہتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کون آپ ﷺ کے ساتھ جائے۔ غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ ﷺ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینہ کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لئے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت میں اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں، میرا ہودج اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودج اونٹ پر رکھ کر روانہ ہوگئے۔

جب میں ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر کار اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آگئی۔ صبح کے وقت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہیں پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا:

انا للہ وانا الیہ راجعون، رسول اللہ ﷺ کی بیوی یہیں رہ گئیں۔

اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لاکر اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ میں اونٹ پر سوار

ہوگئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہوگئے۔دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جالیا جبکہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی میرا پتہ نہ چلا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں''۔

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ مزید فرماتی ہیں:

''مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہوگئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔شہر میں اُس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں۔رسول اللہ ﷺ کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی مگر مجھے کچھ پتہ نہیں تھا البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔آپ ﷺ گھر آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کہ ''کیسی ہیں یہ؟'' خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔اس سے مجھے شبہ ہوا کہ کوئی بات ہے ضرور۔آخر آپ ﷺ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لئے میں مدینے سے باہر گئی اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اور لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔میرے ساتھ مسطح کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔راستے میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا:

''غارت ہو مسطح''۔

میں نے کہا:

''اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو،اور بیٹا بھی وہ جس نے بدر میں حصہ لیا ہے''۔

(یہ وہی مسطح ہے جنہوں نے بہتان کو پورے مدینہ میں خوب اچھالا تھا اور یہاں ام المومنینؓ کس طرح ان کی غیر حاضری میں انہیں اچھے الفاظ میں یاد کر رہی ہیں)

انہوں نے کہا:

''بٹیا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟''۔

پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہوگیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لئے آئی تھی۔ سیدھے گھر گئی اور رات بھر رو کر کاٹی"۔

پھر ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں سیدہؓ پر بہتان کی خبریں اڑتی رہیں یہاں تک ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دے کر مسلمانوں کو مخاطب فرمایا:

"مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کردی۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں"۔

اس پر مسجد نبوی میں ہنگامہ مچ گیا، قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد میں ہی لڑ پڑتے۔ اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔

ہماری ماں سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیقؓ اس واقعہ پر کہتی ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے، میں روتی رہی، میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ میرے والد سیدنا ابوبکرؓ اور ماں ام رومانؓ نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے، اسلئے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عائشہؓ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرما دے گا اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے"۔

ہم نے کہا کہ الفتاح وہ ہے جو اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، الفتاح حق اور

باطل کو واضح کرتا ہے، جب بندے کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلیئے کوئی دلیل نہ ہو تو رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر اس کی بے گناہی ثابت کرتا ہے۔سیدہ عائشہؓ کے پاس اس وقت اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلیئے کچھ نہیں تھا،فرماتی ہیں:

''یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے، میں نے اپنے والد سے عرض کیا:

آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیں''۔

انھوں نے فرمایا:

بیٹی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔

میں نے اپنی والدہ سے کہا:

آپؓ ہی کچھ کہیں، انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں،اس پر میں بولی:

اب سیدہؓ کی بے بسی کا عالم اور ساتھ ہی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سے امید دیکھئے۔

''آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے،اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ نہ مانیں گے اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی تو آپ لوگ مان لیں گے؟''۔

کہتی ہیں:

''اس وقت سیدنا یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا''۔

اندازہ کریں،سیدہ عائشہؓ جو عالمہ اور فقیہہ ہیں،اس قدر حالات کے دباؤ میں ہیں کہ انہیں حضرت یعقوبؑ کا نام یاد نہیں آیا،فرماتی ہیں:

''اس حالت میں میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو سیدنا یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ: فَصَبْرٌ جَمِيلٌ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔اس وقت

اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا''۔

اس وقت سیدہؓ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوسکتی تھی؟۔ وہ خود کہتی ہیں:

''اگر چہ یہ بات تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے مگر میرا گمان تھا کہ رسول اللہ ﷺ کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دے گا''۔

اندازہ کریں کہ سیدہؓ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کاش رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کوئی خواب دکھا دے جس سے برأت ظاہر ہو جائے مگر جب بندہ الفتاح سے رجوع کرتا ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اسے وہ کچھ دیتا ہے جس کا اس نے گمان بھی نہ کیا ہوگا۔ مزید فرماتی ہیں:

''اتنے میں یکا یک رسول اللہ ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو رسول اللہ ﷺ بے حد خوش تھے۔ آپ ﷺ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی:

''مبارک ہو عائشہؓ !، اللہ نے تمہاری برأت کے لئے آیات نازل فرما دی ہیں''۔

پھر آپ ﷺ نے سورہ نور کی آیات 11 تا 21 کی تلاوت کیں:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ...... ﴾

''جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں......''۔

میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔

میں نے کہا:

''میں نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی ہے'' (7)۔

جب مصیبت اور پریشانی کا طوفان بندۂ مومن کو چاروں طرف سے گھیر لے، جب وہ اس قدر بے بس ہو جائے کہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے تو رب سبحانہ وتعالیٰ ''الفتاح'' بن کر اس کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔

الفتاح کے تینوں معانی سمجھ میں آنے کے بعد چند اہم نکات سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ ''الفتاح'' سے ہمارا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ الفتاح کے دروازے پر جب بندہ دستک دیتا ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اس کی فوری طور پر مدد نہیں کرتا بلکہ اس کے صبر وعزیمت کا امتحان لینے کے لئے فتح میں تاخیر کرتا ہے تا کہ معلوم ہو کہ وہ کب تک الفتاح کے دَر سے چمٹا رہے گا۔ وہ الفتاح ہے اس لئے ضرور فتح دے گا مگر آزمانے کے بعد آخری لمحے تک فتح کو مؤخر کرے گا۔ وہ اپنے بندے کو اپنے دروازۂ رحمت کے پاس دیر تک کھڑا دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک بزرگ نے کیا خوب کہا ہے:

''اس کے دروازۂ رحمت سے جڑے رہو، خواہ تمہیں اس سے دھتکار دیا جائے اور قبولیت سے مایوس نہ ہو، خواہ تمہیں خالی ہاتھ لوٹا دیا جائے۔ جب رحمت کا دروازہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے کھول دیا جائے تو تم طفیلی بن کر داخل ہو اور اس سے کہو:

میں مسکین ہوں مجھ پر صدقہ کیجئے، تو نے ہی تو کہا کہ صدقہ فقراء اور مساکین کو دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا دروازۂ رحمت وہ دَر ہے جس سے کوئی مایوس نہیں ہوتا اور یہاں سے جو اپنی نادانی اور بے صبری سے مراد پوری کئے بغیر واپس لوٹ گیا تو زندگی بھر در در کی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔

....

(7) دیکھئے: کتب سیر نیز تفاسیر، سورہ النور، آیات 11 تا 21۔

یہ بھی یاد رہے کہ جس دروازے کو زور سے پیٹا جاتا ہے تو وہ ضرور کھلتا ہے۔ رحمت کے دروازے کو زور سے بھی پیٹنا ہے اور مسلسل دستک بھی دینی ہے، وہ ضرور کھلے گا۔ اس کی بھی کئی مثالیں سیرت پاک میں ملتی ہیں، چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

11 ویں سن نبوت کا زمانۂ حج ہے، پورا عرب منیٰ میں جمع ہے۔ آپ ﷺ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عرب قبائل کو دعوت دیتے ہیں۔ بنو ہذل، بنو شیبان اور بنو ثعلبہ کے علاوہ تمام وفود کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ حج کا موسم ختم ہونے والا ہے مگر کہیں سے بھی کوئی امید افزا جواب نہیں ملتا۔ آپ ﷺ اپنی کوششیں تیز کر دیتے ہیں۔ مزید افراد سے انفرادی اور اجتماعی طور پر ملاقاتیں کرتے ہیں، انہیں اسلام کی حقانیت بتاتے ہیں، قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، آخرت میں جنت کی خوشخبری دیتے ہیں مگر کوئی ایمان نہیں لاتا۔ آخر کار حج کا موسم ختم ہو گیا، لوگ واپسی کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں، سامان باندھا جا رہا ہے، خیمے اکھاڑے جا رہے ہیں مگر اس کے باوجود رسول اکرم ﷺ اپنی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم نے کہا الفتاح وہ ہے جو دروازہ کھولتا ہے، ضرور کھولتا ہے مگر ذرا دیر سے کھولتا ہے اور جب دیتا ہے تو توقع سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔ سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گزرتے ہیں تو کچھ نوجوانوں کو باہم گفتگو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ سیدھا ان کا رخ کرتے ہیں اور ان کے پاس جا پہنچتے ہیں۔ یہ 6 نوجوان تھے جو یثرب (مدینہ منورہ) سے حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ اپنا سامان باندھ کر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا:

آپ کون لوگ ہیں؟۔

انہوں نے کہا کہ ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یعنی یہود کے حلیف''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود کے ساتھ رہن سہن سے انہوں نے ضرور سن رکھا ہوگا کہ اس زمانے میں ایک نبی کی بعث ہونے والی ہے۔انہوں نے کہا''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پھر کیوں نہ آپ حضرات بیٹھیں، کچھ بات چیت ہو جائے''۔

وہ لوگ بیٹھ گئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام کی دعوت دی، قرآن کی آیات پڑھ کر سنائیں اور آخرت میں جنت کا شوق دلایا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی بات ختم کی تو وہ نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر ایک نے دوسرے کو بولا:

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے ہیں، دیکھو! کہیں یہود تم پر سبقت نہ لے جائیں''(8)۔

یہ یثرب کے عقلاء الرجال تھے چنانچہ فوراً اسلام قبول کرتے ہیں اور اس طرح مدینہ منورہ میں اسلام کا بیج بویا جاتا ہے۔

اس واقعہ میں جہاں بے شمار اسباق ہیں وہاں یہ سبق بھی اس میں پوشیدہ ہے کہ''الفتاح'' پر بھروسہ کیا گیا تو وہ فتح ونصرت اور کامیابی کے راستے کا وہاں سے انتظام کرے گا جہاں سے کسی کا وہم وگمان بھی نہیں جاتا۔کسے معلوم تھا کہ منیٰ کی گھاٹی میں اسلام قبول کرنے والے یہ نوجوان دراصل انصار کا ہراول دستہ بنیں گے اور پھر اسلام کیلئے ایک سرزمین میسر ہوگی جہاں اسلام کا نور چہار دانگ عالم میں پھیلے گا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی اس طرح کے اسباق ہیں۔سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنویں میں پھینکتے ہیں مگر یہی کنواں سیدنا یوسف علیہ السلام کے عروج کا نکتۂ آغاز ثابت ہوتا

....

(8) کتب سیر۔

ہے۔آپؑ کوجیل میں ڈالا جاتا ہے جہاں 9 سال تک وہ جرم بے گناہی کی سزا کاٹتے ہیں۔بظاہر زمینی حقائق یہی بتاتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام زندگی بھرجیل میں ہی رہیں گے۔مصر میں کون تھا جو آپؑ کوجیل سے نکال سکتا تھا۔فتح ونصرت کا راستہ وہاں سے آیا جہاں کسی کا گمان نہیں جاتا تھا۔بادشاہ کو خواب آیا جس کی تعبیر پورے مصر میں سوائے سیدنا یوسف علیہ السلام کے کسی کے پاس نہیں تھی۔

صلح حدیبیہ تاریخ اسلام کا وہ باب ہے جہاں اسلام کی فتح ونصرت اور لوگوں کا اسلام میں جوق درجوق داخل ہونے کا سبب ہے مگر صلح حدیبیہ جن حالات میں ہوااگر ان حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی سخت شرائط کوتسلیم کر کے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس صلح کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحاً مُّبِیۡناً ﴾

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کھلی فتح عطا کردی''(9)۔

صلح حدیبیہ کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کا ردعمل سب کے علم میں ہے۔اس پر سیدنا عمرؓ نے جو سوالات کیئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس صلح کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں:

''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ فتح ہے؟''۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ''ہاں۔''ایک اور صحابی حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے،ہاں یہی فتح ہے''۔

سیدنا جابرابن عبداللہؓ،سیدنا براء بن عازبؓ اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

....

(9)الفتح 1

''لوگ فتح مکہ کو فتح کہتے ہیں حالانکہ ہم اصل فتح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں''۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ اس صلح کے چند سال بعد رسول اکرم ﷺ مکہ مکرمہ کو فتح کرتے ہیں اور بعد ازاں لوگ جوق در جوق دین حق میں داخل ہوتے ہیں:

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴾

''جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے''(10)۔

اس سے ایک اور سبق بھی ملتا ہے، وہ یہ کہ ''الفتاح'' جب فتح دیتا ہے تو وہ عام فتح نہیں بلکہ فتح مبین ہوتی ہے۔

الفتاح سبحانہ وتعالیٰ سے صدق دل کے ساتھ رجوع کیا جائے تو وہ وہاں سے دیتا ہے جہاں سے انسان کا گمان نہیں ہوتا اور اتنا دیتا ہے جس کی توقع تک نہیں کی جاتی۔ اس حوالے سے بے شمار مثالوں میں سے سیدہ ہاجر علیہا السلام کا واقعہ پیش خدمت ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے دودھ پیتے بچے سیدنا اسماعیل اور اہلیہ سیدہ ہاجر علیہا السلام کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑتے ہیں جہاں بظاہر زندہ رہنے کے اسباب ناپید ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب اپنی اہلیہ سیدہ ہاجر علیہا السلام کو بطن مکہ میں چھوڑ کر واپس پلٹتے ہیں تو سیدہ دیکھتی ہیں کہ آپؑ کچھ کہے سنے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں۔ سیدہؑ اپنے ساتھ کھانے پینے کا جو سامان لائی تھیں وہ چند دنوں کے بعد ختم ہو جائے گا، اس کے بعد اس وادی میں گزر بسر کیسے ہوگی؟ وہ آپؑ کو پکار کر کہتی ہیں:

''ابراہیمؑ! ہمیں یہاں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟''۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتے بلکہ ایک لمحہ کیلئے رکتے تک نہیں۔ سیدہؑ دوبارہ یہی سوال کرتی ہیں مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نہ صرف کوئی جواب دیتے ہیں بلکہ ان کی رفتار میں معمولی سا فرق تک نہیں آتا۔ سیدہ ہاجر علیہا السلام ان کے پیچھے دوڑتی ہیں اور تیسری مرتبہ وہی سوال کرتی ہیں مگر دوسری طرف سے جب

....

(10)النصر 1

کوئی جواب نہیں ملتا تو آپ علیہا السلام وہ بات کہتی ہیں جو آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہے:

آاَللّٰهُ اَمَرَکَ بِھٰذَا

''کیا اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟''۔

سیدنا ابرہیم علیہ السلام اثبات میں جواب دیتے ہیں تو سیدہؑ فرماتی ہیں:

اَذًا لَنْ یُّضَیِّعَنَا

''پھر وہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا''۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ بندہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کام کرے اور یہ سمجھ کر کرے کہ یہ میرے رب کا حکم ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اسے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

سیدہ ہاجر علیہا السلام اپنے ننھے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ چند دن رہتی ہیں پھر کھانے پینے کا سامان ختم ہوجاتا ہے جو وہ اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ ننھے اسماعیل علیہ السلام کو پیاس ستاتی ہے، بچے کو پیاس سے بلکتا دیکھ کر سیدہؑ بے قابو ہوجاتی ہیں۔ وہ صفا کی پہاڑی پر چڑھ جاتی ہیں تاکہ دیکھ سکیں کہ کہیں کوئی انسان، کوئی چرند پرند نظر آرہا مگر وہاں کوئی نظر نہیں آتا، پھر وہ دوڑ لگاتی ہوئی مروہ کی پہاڑی پر جاتی ہیں، وہاں دیکھتی ہیں مگر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ ماتا کی ماری سیدہؑ اس طرح 7 چکر لگاتی ہیں حالانکہ پہلے چکر میں ہی یقین ہوگیا تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ سیدہ علیہا السلام کی یہ ادا رب سبحانہ وتعالیٰ کو پسند آتی ہے۔ وہ ان کے لئے، ان کے بچے کیلئے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے اس بے آب وگیاہ وادی میں ایک چشمہ جاری کردیتا ہے۔

اس وقت اگر سیدہؑ سے پوچھا جاتا:

''بی بی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''۔

وہ یقیناً کہتیں:

''پانی کے چند قطرے مل جائیں تو بچے کو پلا دوں''۔

سیدہؓ کی یقیناً یہی سب سے بڑی خواہش ہوتی مگر الفتاح سبحانہ وتعالیٰ جب دیتا ہے تو بے حد وحساب دیتا ہے۔ اگر سیدہؓ کو چند قطرے ہی مل جاتے تو وہ اس پر راضی ہو جاتیں مگر اس نے جب دیا تو ''چھپر پھاڑ کر دیا''۔ زمزم کا کنواں جو قیامت تک خشک نہیں ہوگا اور عمرہ کی ادائیگی کے وقت صفا و مروہ کے درمیان سعی ہمیں ایک ماں کی یاد دلاتے ہیں جس نے اللہ کے بھروسے پر یہاں قیام کیا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو سبق دیا کہ:

''اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا''۔

معلوم ہوا کہ الفتاح جب دیتا ہے تو بے حد وحساب دیتا ہے اور وہاں سے دیتا ہے جہاں سے گمان نہیں ہوتا۔ شرط یہ ہے کہ اس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے اور اس کے در سے چمٹا جائے۔

الفتاح جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے، جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے، جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے اور جو اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، کیا اس سے اس امت کی ناگفتہ بہ حالت پوشیدہ ہے؟۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ مسلمان آج کس ذلت ورسوائی اور پستی میں ہیں؟ یقیناً اُس سے ہمارا حال پوشیدہ نہیں، الفتاح ضرور اس امت کو فتح دے گا، یقیناً جلد فتح دے گا، وہ ضرور اِس دین کو غالب کرے گا کیونکہ یہ دین غالب ہونے کیلئے آیا ہے۔ اس کیلئے شرط یہ ہے کہ امت اپنی حالت بدلنے کیلئے پہلے خود کوشش کرے، الفتاح سے تعلق جوڑ دے، اس سے رجوع کرے اور یقین کرے کہ وہ اسے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

یہ امت غالب ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اپنی مدد ونصرت اس وقت تک نہیں بھیجتا جب تک انسانوں کا ایک معقول گروہ اپنی تمام تر صلاحیتیں، پوری کوششیں اور ساری توانائیاں اس دین کو غالب

کرنے پر نہیں لگا دیتا۔ ایک اور اہم بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو غالب کرنے کی ذمہ داری امت کے سپرد کی ہے۔ امت جب تک اپنی کوششوں کو انتہا تک نہیں لے جاتی، اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں آئے گی۔

حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ میں ہمارے لئے ایک اہم سبق ہے۔ حضرت مریم بتول علیہا السلام کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے رب سبحانہ وتعالیٰ کا فرماتا ہے:

﴿ فَأَجَاءَ هَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ ﴾

''پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا''۔

علمائے تفسیر کا کہنا ہے کہ وہ کھجور کے درخت کا تنا تھا، پورا درخت نہیں تھا، اس حالت میں حضرت مریم علیہا السلام کی بے بسی دیکھئے:

﴿ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنتُ نَسْياً مَّنسِيّاً ﴾

''وہ کہنے لگی: کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا''۔

﴿ فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيّاً ﴾

''فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا: غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے''۔

﴿ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيّاً ﴾

''اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر وتازہ کھجور ٹپک پڑیں گے''۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کھجور کے تنے سے درخت اگا دیا، ان کے نیچے چشمہ جاری کر دیا، درخت میں فوری طور پر کھجور پکا دیئے، اگر کھجور بھی گرا دیتا تو کیا ہوتا؟۔ اس نے کھجور نہیں گرائے بلکہ زچگی کے عالم میں بھی حضرت مریم علیہا السلام سے مطالبہ کیا کہ کھجور کے تنے کو ہلا۔ دس صحت مند آدمی بھی کھجور کے تنے کو نہیں ہلا سکتے۔

اس سے کیا سبق ملا؟۔

جو کام انسان کے بس سے باہر ہے وہ اللہ تعالی خود کرتا ہے۔

تنے کو کھجور کے درخت میں تبدیل کرنا انسان نہیں کرسکتا، اللہ تعالی نے کر دیا......

چشمہ انسان جاری نہیں کرسکتا، اللہ تعالی نے کر دیا......

درخت سے کھجور کا پھل انسان نہیں پکا سکتا، اللہ تعالی نے پکا دیا......

مگراس کی سنت ہے کہ انسان جب تک اپنی کوششوں کو انتہائی حد تک نہیں پہنچا تا اس کی مدد نہیں آتی۔اس عالم میں بھی حضرت مریم علیہا السلام سے مطالبہ کیا گیا کہ آپؑ اپنی کوششوں کو انتہائی حد تک پہنچائیں تاکہ اللہ تعالی مدد و نصرت آئے۔ اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ زچگی کے عالم میں حضرت مریم علیہا السلام کھجور کے تنے کو نہیں ہلا سکتیں، ان سے جو مطلوب تھا وہ کوشش تھی، انہوں نے اپنی کوشش کو انتہا درجے تک پہنچایا تب کھجور ان کے اوپر گرے۔

معلوم ہوا کہ الفتاح اس امت کو غالب کرے گا، ضرور غالب کرے گا مگراس کی مدد و نصرت کا حصول امت کی کوشش کے بغیر نہیں آئے گا۔امت اپنی کوشش کو انتہا حد تک لے جائے، پھر اللہ تعالی اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے اپنی مدد بھیجے گا۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دین کیلئے استعمال کرے۔ دین کو غالب کرنے کی کوشش میں لگا دے اور ہمارے کام میں اخلاص پیدا کرے۔

نوٹ:

یہ موادتقریر کی صورت میں بھی دستیاب ہے۔

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الرزاق، الرازق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ، إِنَّ اللّٰهَ هُوَالرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں، میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اللہ تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست''(1)۔

الرازق الرزاق دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں شامل ہیں اور دونوں تقریباً ہم معنیٰ ہیں۔

الرزاق کا مطلب ہے،سب کا روزی رساں اور الرازق کا مطلب ہے بہتر رزق دینے والا۔

رزق کے اصلی معنیٰ ہیں کسی کو کسی چیز سے نفع حاصل کرنے کی کھلی چھٹی دے دینا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت الرزاق ہے، وہ ذات باری تعالیٰ ہر جاندار کیلئے رزق پیدا کرنے اور رزق حاصل کرنے کیلئے اسباب مہیا کرنے والا ہے۔

رزق کی 2 قسمیں ہیں:

ظاہری رزق: جس میں غذا، پھل اور مشروبات وغیرہ آتے ہیں جنھیں کھانے سے جسم کو طاقت

....

(1)الذاریات 56 تا 58

وتوانائی مہیا ہوتی ہے اور انسان لذت وفرحت محسوس کرتا ہے۔

باطنی رزق :یعنی ایمان، جس سے ابدی زندگی یعنی آخرت کیلیئے رہنمائی ملتی ہے،اس سے دین کا شعور اور دل کو سکون میسر آتا ہے۔اس غذا کیلیئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے اور رہنمائی کیلیئے آسمان سے کتب نازل فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ جس کیلیئے چاہتا ہے دونوں رزق یعنی مال ودولت اور علم وفراست فراخ کر دیتا ہے، جس کیلیئے چاہتا ہے دونوں رزق تنگ کر دیتا ہے اور جس کیلیئے چاہتا ہے دونوں میں سے ایک فراخ اور دوسرا تنگ کر دیتا ہے۔

زبان میں رزق کا مطلب تقسیم اور نصیب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم ''الرزاق'' قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے جبکہ ''الرازق'' قرآن مجید میں 5 مقامات پر ''خیر الرازقین'' کے صیغے میں آیا ہے۔قرآن مجید میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے اسم کے طور پر الرازق نہیں آیا۔

الرزاق اور الرازق میں کیا فرق ہے؟

الرازق وہ ہے جو کبھی دیتا ہے، کبھی روکتا ہے، کبھی کسی کو دیتا ہے تو کبھی کسی اور کو روکتا ہے جبکہ الرزاق وہ ہے جو سب کو بلا انقطاع مسلسل دیتا ہے۔اس کے عطا کا کوئی حدوحساب نہیں، وہ مومن کو بھی رزق دیتا ہے اور کافر کو بھی۔

ارشادالٰہی ہے:

﴿ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِى كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴾

''زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ

جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے‘‘ (2)۔

ایک اور مقام پر اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَكَأَيِّن مِن دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾

’’ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے‘‘ (3)۔

یہ بات مشاہدے میں ہے کہ بہت سے جانور اپنا رزق ذخیرہ نہیں کرتے۔ وہ روزانہ رزق کے حصول کیلئے نکلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں روزانہ رزق دیتا ہے۔ گزشتہ آیت میں إِلَّا عَلَى اللّٰه آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے رزق کی فراہمی اللہ تعالی نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔

سیدنا ابرہیم علیہ السلام نے کعبے کی دیواریں اٹھالیں تو یوں دعا کی:

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ﴾

’’ اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے‘‘۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رزق کو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ جوڑ دیا تھا مگر رزق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، وہ کافر اور مسلم دونوں کو رزق دیتا ہے، اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فرمایا:

﴿ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلاً ﴾

....

(2) ہود 6

(3) العنکبوت 60

''اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا'' (4)۔

اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں تمام جانداروں کے رزق کا سامان فراہم کر دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ، وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاء لِّلسَّائِلِينَ ﴾

''اے نبی (ﷺ)! ان سے کہو، کیا تم اس اللہ سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا، وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے، اس نے زمین کو وجود میں لانے کے بعد اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کیلئے ہر ایک کی طلب وحاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا، یہ سب کام چار دن میں ہو گئے'' (5)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا:

﴿ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَفْعَلُ مِن ذَلِكُم مِّن شَيْءٍ ﴾

''اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟'' (6)۔

یہاں رزق کے معاملے میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ رزق کا معاملہ تو بہت

....

(4) البقرہ 126

(5) حم سجدہ 9، 10

(6) الروم 40

پہلے طے کر دیا گیا ہے۔رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے ہر کوئی اپنی ماں کے پیٹ میں نطفے کی صورت میں 40 دن رہتا ہے، پھر وہ 40 دن لوتھڑا رہتا ہے، پھر 40 دن بوٹی رہتا ہے پھر اللہ کی طرف سے فرشتے کو بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کے متعلق 4 باتوں کا فیصلہ ہوتا ہے: اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور یہ کہ وہ شقی ہے یا سعید'' (7)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آنے والے ہر انسان کے رزق کا فیصلہ اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ اندازہ کیجئے جس رزق کے لئے ہم اپنے آپ کو ہلکان کئے بیٹھے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے چکر میں ہیں، وہ حقیقت میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا ہمارے لئے لکھ دیا گیا ہے نیز ہم میں سے کسی کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک ہم اپنے حصے کا لکھا ہوا رزق مکمل طور پر نہ حاصل کر لیں، رسول اکرم ﷺ کا فرمان ذی شان ہے:

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ اَنَّهُ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا

''روح القدس نے مجھے الہام کیا کہ کسی متنفس کو موت نہیں آسکتی جب تک اس کا رزق اور عمر پورے نہ ہو جائیں'' (8)۔

دور جدید میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آسائش کے حصول میں ہم بھول گئے کہ رزق کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَمَّنْ هَذَا الَّذِیْ يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ بَل لَّجُّوا فِیْ عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴾

....

(7) حدیث صحیح: بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، بخاری 7454، مسلم 2643

(8) یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوامامہؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے۔ علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے اس کے بارے میں کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے نیز یہ متعدد طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ دیکھئے: فقہ السیرہ 91۔ علامہ ابن اثیرؒ نے شرح مسند الشافعی میں اسے مشہور قرار دیا ہے۔ دیکھئے: شرح مسند الشافعی 5/546۔

''یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمھیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں'' (9)۔

ایک بزرگ سے پوچھا گیا: ''آپ کو کھانا پینا کون دیتا ہے''۔

انہوں نے جواب دیا:

''میں اللہ کے خزانوں سے کھاتا پیتا ہوں''۔

آدمی نے غصے سے کہا:

''کیا وہ آپ پر روٹی کی بارش کرتا ہے''۔

بزرگ نے کہا:

''یہ زمین اگر اس کی ملک نہ ہوتی تو وہ یقیناً آسمان سے روٹی کی بارش کرتا''۔

اس بزرگ نے کتنی بڑی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ واقعی یہ زمین اگر اللہ تعالیٰ کی نہ ہوتی تو وہ آسمان سے ہم پر رزق برساتا مگر کیونکہ اس نے ہمارے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے اور یہ زمین بھی اسی کی ہے تو وہ ہمیں اتنا ہی رزق دیتا ہے جتنا ہمارے مقدر میں ہے۔

رزق صرف روزی نہیں بلکہ ہر عطا کی ہوئی چیز کا شمار رزق میں ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ

''بندہ گناہ کے باعث رزق سے محروم کردیا جاتا ہے'' (10)۔

....

(9) الملک 21

(10) حدیث صحیح: بروایت حضرت ثوبانؓ، الجامع الصغیر، از امام سیوطیؒ 4262، شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے بھی مجموع الفتاوی میں اسے صحیح کہا ہے تاہم اسی طرح کی ایک حدیث ضعیف الجامع میں ہے جس کا ترجمہ ہے: دعا قضا کو لوٹاتی ہے اور نیکی رزق میں کشادگی کا باعث ہے اور بندہ گناہ کے باعث رزق سے محروم کردیا جاتا ہے''۔ اس حدیث کو علامہ البانیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھئے: ضعیف الجامع 3006۔

معلوم ہوا کہ گناہوں کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دی جاتی ہے اوراس سزا کی ایک صورت رزق کی تنگی بھی ہے۔اس کی تائیدسورہ النساء کی آیت 123 سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

﴿ مَن يَعۡمَلۡ سُوٓءًا يُجۡزَ بِهِۦ ﴾

''جوبھی برائی کرے گااس کا پھل پائے گا'' (11)۔

معلوم ہوا کہ جوکوئی دنیا میں برائی کرے گااس کی لازماً سزااسی دنیا میں پہلے پائے گا جبکہ آخرت کی سزااوربھی شدید ہے اور یہ سزارزق کی تنگی کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اورکسی اورصورت میں بھی، اثر میں آیاہے کہ ایک آدمی نے کہا:

''اے اللہ تو کتنا کریم ہے، میں تیری نافرمانی کرتا ہوں اورتو مجھے سزانہیں دیتا''۔

اسے آواز آئی:

''میں تجھے برابرسزادے رہاہوں مگر تجھے اس کا شعورنہیں! کیا میں نے تم سے مناجات کی لذت نہیں چھینی''۔

گناہوں کی سزاکے طور پراللہ تعالیٰ کبھی کبھی انسان سے اطاعت کی لذت چھین لیتا ہے۔ پھرآدمی روح سے خالی بندگی کرتا تو ہے مگراسے اُس کی اِس اطاعت کے وہ ثمرات حاصل نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔موجودہ دور میں ہم جوگناہ کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ان پر ہمیں دنیا میں کوئی سزانہیں ملے گی تو یہ ہماراغلط تصورہے،سلف صالحین میں سے کسی نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں اپنی اونٹنی کے رویہ کودیکھ کرسمجھ جاتا ہوں کہ اس کا یہ رویہ میرے گناہ کی وجہ سے ہے''۔

صحابہ کرامؓ کے آخری دور میں دنیا فتح ہوئی اور مفتوحہ ممالک کی مال ودولت سمٹ کر مسلمانوں کے قبضے میں آئی تو صحابہ کرامؓ نے اپنے دور کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

....

(11) النساء 123

''تم گناہ کرتے ہو اور وہ گناہ تمہاری نظر میں بال سے زیادہ باریک ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم ان گناہوں کو کبائر میں شمار کرتے تھے۔''

بزرگوں کا کہنا ہے کہ گناہوں کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ آدمی گناہ کو ہی بھول جائے۔

برزگوں کا کہنا ہے کہ سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ انسان کے دل سے گناہ کے قبح کا تصور ختم کردے''۔

یعنی آدمی گناہ کرے اوراس کو برا نہ سمجھے۔اسے گناہ میں لذت میں محسوس ہونے لگے۔

بزرگوں کا کہنا ہے:

''اگر تم دیکھو کہ لوگ تمہیں سراہتے ہوئے اچھا سمجھ رہے ہیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے پردے کو دیکھ کر دھوکہ کھا رہے ہیں''۔

الرزاق اور الرازق وہ ہے جس نے اپنے تمام بندوں کا رزق مقرر کررکھا ہے جس سے ذرا برابر کم ہوگا نہ زیادہ ملے گا مگر انسان ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کے حصول کے چکر میں رہتا ہے۔رسول اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

لَوْ كَانَ لِاِبْنِ آدَمَ وَادٍ مِنْ ذَهَب اَحَبَّ اَنْ لَهُ وَادِيًا آخر، وَلَنْ يَمْلأُ فَاهُ اِلَّا التُّرَاب

''اگر ابن آدم کے پاس سونے کی وادی ہو تو وہ دوسری وادی کی خواہش کرے گا، آدمی کا منہ مٹی ہی بھر سکتی ہے''(12)۔

یہ حقیقت اگر انسان کو معلوم ہوجائے تو اس کے ادراک سے اسے بندگی کا وہ مقام ملے گا جس کیلئے

....

(12)حدیث صحیح :بروایت حضرت انس بن مالک، صحیح مسلم 1048 جبکہ علامہ ناصرالدین الالبانیؒ نے السلسلة الصحیحة میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ اگر ابن آدم کے سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی بھی تمنا کرے گا۔علامہ البانیؒ نے اسے متواتر کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ، مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ، إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴾

''میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں، میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اللہ تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست'' (13)۔

بندگی کا احساس انسان میں یہ حقیقت پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، مجھے جو چیز مانگنی ہے اُسی سے مانگی چاہئے اور اس کائنات میں کوئی نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے جو دے سکتا ہو۔ اگر وہ رزق تنگ کرتا ہے تو اُس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے نیز جب وہ کسی چیز سے محروم کرتا ہے تو دراصل وہ کوئی بہتر متبادل کا انتظام کرتا ہے، اس حوالے سے ایک بڑھیا کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے:

ایک بڑھیا کسی ویرانے میں خیمہ گاڑ کر بیٹھتی ہے جہاں اپنے گزربسر کیلئے خیمہ کے سامنے کی زمین پر ہل چلاتی ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے، گویا اس کے گزر بسر کا واحد ذریعہ یہی کھیتی ہے۔ جب کھیت لہلہا اُٹھتی ہے تو ایک رات شدید آندھی، طوفان اور بارش ہو جاتی ہے۔ بادل رات بھر خوب برستے ہیں۔ وہ اپنے خیمے میں بارش اور آندھی سے چھپی بیٹھی رہتی ہے، آخر کار اسے نیند آ جاتی ہے۔ جب دن چڑھتا ہے تو بڑھیا اپنا سر خیمے کے دروازے سے باہر نکال کر دیکھتی ہے کہ رات کی بارش اور آندھی نے کتنا نقصان کیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ اس کے گزر بسر کا واحد ذریعہ، اس کی کھیتی اجڑ چکی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا:

....

(13) الذاریات 56 تا 58

''اے اللہ! تو جو چاہے کر...... میرا رزق تیرے ذمے ہے''۔

آندھی بھیج، طوفان بھیج، بارش برسا اور میری کھیتی خراب کر، تیری مرضی۔ میں تو ایک بات جانتی ہوں کہ میرا رزق تیرے ذمہ ہے۔

اندازہ کیجئے کہ کس طرح اس بڑھیا کو یقین تھا کہ میرا رزق اس کھیتی میں نہیں بلکہ میرا رزاق موجود ہے، اگر کھیتی خراب ہوگئی تو میرا رزق بند نہیں ہوا، وہ رزاق کہیں نہ کہیں سے انتظام کر دے گا۔

یہ بندگی کا وہ مقام ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پایا تھا۔

جب وہ مصر سے نکلے اور مدین پہنچے تو بھوک نے ستایا، ایک ادنیٰ سی چیز یعنی روٹی کا نوالہ بھی اللہ سے مانگا:

﴿ رَبِّ إِنِّى لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴾

''پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں''۔

اور جب طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو اس بلند ترین مقام کے حصول کا مطالبہ بھی اللہ تعالیٰ سے کیا جو اس دنیا میں ممکن نہیں تھا۔ آپؑ نے کہا:

﴿ قَالَ رَبِّ أَرِنِى أَنظُرْ إِلَيْكَ ﴾

''یارب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔

معلوم ہوا کہ الرزاق وہ ہے جس سے تمام چیزیں طلب کی جائیں خواہ وہ چیزیں ہماری نظر میں کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہوں۔ جب یہ یقین پیدا ہو جائے تو پھر اس سے اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ میرا پاس جو کچھ بھی ہے، وہ ختم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے:

﴿ مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ ﴾

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے

والا ہے'' (14)۔

انسان رزق کی سعی میں جب ایمان اور یقین سے عاری ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے رزق کا انتظام کرتا ہے بلکہ بچوں اور بچوں کے بچوں کی بھی بھی فکر کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر یقین اور اس پر ایمان ہو تو اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے اور انہیں کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ سورہ الکھف میں ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ انسان کے ایمان اور یقین کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے مرنے کے بعد اس کے بچوں کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے۔ سیدنا خضر اور موسیٰ علیہم السلام کا جب ایک بستی سے گزر ہوتا ہے تو وہاں ایک دیوار ایسی ملتی ہے جو گرا چاہتی ہے۔ سیدنا خضر علیہ السلام اسے نئے سرے سے تعمیر کر کے سیدھا کر دیتے ہیں۔ بعد میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے استفسار پر وہ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

﴿ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا ﴾

''اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں، اس دیوار کے نیچے ان بچوں کا خزانہ مدفون ہے'' (15)۔

یہ یتیم اور ناتواں بچے ہیں، اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن ہے، اگر دیوار گر گئی تو انکا خزانہ ظاہر ہو جائے گا اور لوگ اسے لوٹ لیں گے جبکہ وہ یتیم اپنے خزانے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ بچے جوان ہوں تو اپنے خزانے کو نکال لیں جبکہ اس حالت میں وہ اس کی حفاظت کر سکتے ہوں۔ یہ سارا اہتمام ان یتیم بچوں کے لئے کیوں کیا گیا:

﴿ وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً ﴾

....

(14) النحل 96

(15) الکھف 82

''اوران کا باپ ایک نیک آدمی تھا'' (16)۔

معلوم ہوا کہ انسان کی نیکی اوراس کی صالحیت اس کے بچوں کو بھی کام آتی ہے۔

سورہ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو کتاب ہدایت قرار دیا ان لوگوں کیلئے جو:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾

''غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' (17)۔

اور ہم طے کر کے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تمام چیزیں رزق ہیں، اس رزق سے خرچ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور یہ بجز اس کے ممکن نہیں کہ انسان کو یقین ہو کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴾

''جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب، کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا'' (18)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

....

(16) الکہف 82

(17) البقرہ 3

(18) المنافقون 10

يَقُوْلُ الْعَبْدُ : مَالِيْ ، مَالِي ، اِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلاثٌ ، مَا اَكَلَ فَافْنَىٰ ، اَوْ لَبِسَ فَاَبْلَىٰ ، اَوْ اَعْطَىٰ فَاقْتَنَىٰ وَمَاسِوَىٰ ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ

’’بندہ کہتا ہے: میرا مال! میرا مال! حالانکہ اس کے مال میں سے تین چیزیں اس کی ہیں، جو اس نے کھا کے ختم کر دیا، یا پہن کے بوسیدہ کر دیا یا (صدقہ) دے کر (آخرت کا) توشہ بنا دیا اس کے سوا جو مال ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ کر (اس دنیا سے) چلا جائے گا‘‘ (19)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴾

’’ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے، جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے‘‘ (20)۔

ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ، سیدنا بلالؓ کے ہاں تشریف لے گئے ۔سیدنا بلالؓ، آپ ﷺ کے خازن بھی تھے۔آپ ﷺ نے سیدنا بلالؓ کے پاس ایک پوٹلی میں کھجور دیکھی۔آپ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا تو سیدنا بلالؓ نے عرض کیا:

شَيْءٌ اِدَّخَرْتَهُ لِغَدٍ

’’تھوڑی سی کھجور ہے جسے میں نے کل کیلئے محفوظ کر رکھا ہے‘‘۔

آپ ﷺ اس پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

اَمَا تَخْشَىٰ اَنْ تَرَىٰ لَهُ بُخَارًا فِيْ نَارِ جَهَنَّمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، اِنْفِقْ بِلَال ! وَلَا تَخْشَىٰ مِنْ

....

(19) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، مسلم 2959، صحیح الجامع 8133

(20) الحدید 7

ذِیْ الْعَرْشِ اِقْلَالًا

"کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں کہ ذخیرہ کی ہوئی یہ کھجور قیامت کے دن جہنم کی آگ کا دھواں بن جائے، اے بلال! اللہ کی راہ میں خرچ کر اور بچا بچا کر نہ رکھ، وہ عرش والا تمہیں دینے میں کمی نہیں کرے گا" (21)۔

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنْفِقْ ، یُنْفِقِ اللّٰہُ عَلَیْکَ

"تو بندوں پر خرچ کر، اللہ خزانۂ غیب سے تجھے دیتا رہے گا" (22)۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد تیز قدموں سے دولت کدے کی طرف تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور صحابہ کرامؓ کے چہروں پر حیرت واستعجاب کے آثار دیکھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذَکَرْتُ شَیْئًا مِنْ تَبْرٍ عِنْدَنَا، فَکَرِھْتُ اَنْ یُمْسِیْ عِنْدَنَا فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِہٖ

"مجھے یاد آیا کہ (صدقے سے بچا ہوا) سونے کا ایک ٹکڑا گھر میں رہ گیا ہے، مجھے برا لگا کہ یہ رات بھر ہمارے ہاں رہے، اس لئے میں نے اسے (غریبوں میں) تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے" (23)۔

ہم کہتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں جو کچھ بوئے گا، آخرت میں وہی کچھ کاٹے گا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ

....

(21) دیکھئے: تخریج مشکوٰۃ المصابیح 1826، علامہ البانی نے اسے "صحیح بمجموع طرقه" کہا ہے جبکہ اس سے ملتی جلتی دیگر روایات مختلف کتب حدیث میں ہیں جن پر محدثین نے کلام کیا ہے۔

(22) حدیث ضعیف: بروایت حضرت قیس بن سلع انصاریؓ، دیکھئے: ضعیف الترغیب والترهیب 542، جبکہ حدیث کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث مبارکہ میں بھی آئے ہیں جنہیں علامہ منذریؒ نے اپنی کتاب "الترغیب والترهیب" میں نقل کیا ہے اور اسے صحیح یا حسن قرار دیا ہے۔

(23) حدیث صحیح: بروایت حضرت عقبہ بن حارثؓ، بخاری 1221، واضح رہے کہ متن میں "تِبْرٍ" استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب وہ خالص سونا جسے زیور میں ڈھالا نہ گیا ہو، ہیرے جواہرات کو زیور میں ڈھالنے سے پہلے بھی تبر کہتے ہیں۔ دیکھئے: لسان العرب

نے ہم سے اس مال سے خرچ کرنے کا مطالبہ کیا ہے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنا من پسند مال خرچ کرنے سے آخرت میں ہمیں من پسند انعام دیا جائے گا۔

ایک آدمی نے فقراء اور مساکین کیلئے بدترین قسم کی کھجوریں ایک جگہ پر لٹکا دیں تا کہ فقراء اور مساکین اس میں سے کھائیں۔ رسول اکرم ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا:

لَوْشَاءَ رَبَّ هٰذِهِ الصَّدَقَةِ تَصَدَّقَ بَاَطْيَبَ مِنْهَا، اِنَّ رَبَّ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ يَأْكُلُ حَشَفًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

"بدترین کھجوروں کا صدقہ کرنے والا اگر چاہتا تو اس سے بہتر صدقہ کر سکتا تھا، جس طرح اس نے بدترین کھجوروں کا صدقہ کیا ہے، قیامت کے دن اسے بھی کھانے کیلئے بدترین کھجوریں دی جائیں گی" (24)۔

دراصل جب دنیا کی سب سے بڑی اور نمایاں علامت حب مال ہے۔ دنیا کی محبت دلوں سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرے۔ اس سے اس کے دل میں یقین پختہ ہوگا کہ دراصل یہ مال اللہ تعالی کی امانت ہے اور وہی رزاق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یقین پیدا کرنے کی توفیق عطا کرے کہ وہی رازق ہے اور وہی رزاق، آمین۔

....

(24) حدیث حسن: صحیح نسائی 2492، ابوداؤد 1608، ابن ماجہ 1486، صحیح الترغیب 879، علامہ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ واضح رہے کہ متن میں "حشف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ "تمر حشف" وہ کھجور ہے جو بدترین قسم کی ہو، حشف اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو خشک، بدذائقہ اور سوکھی ہو۔